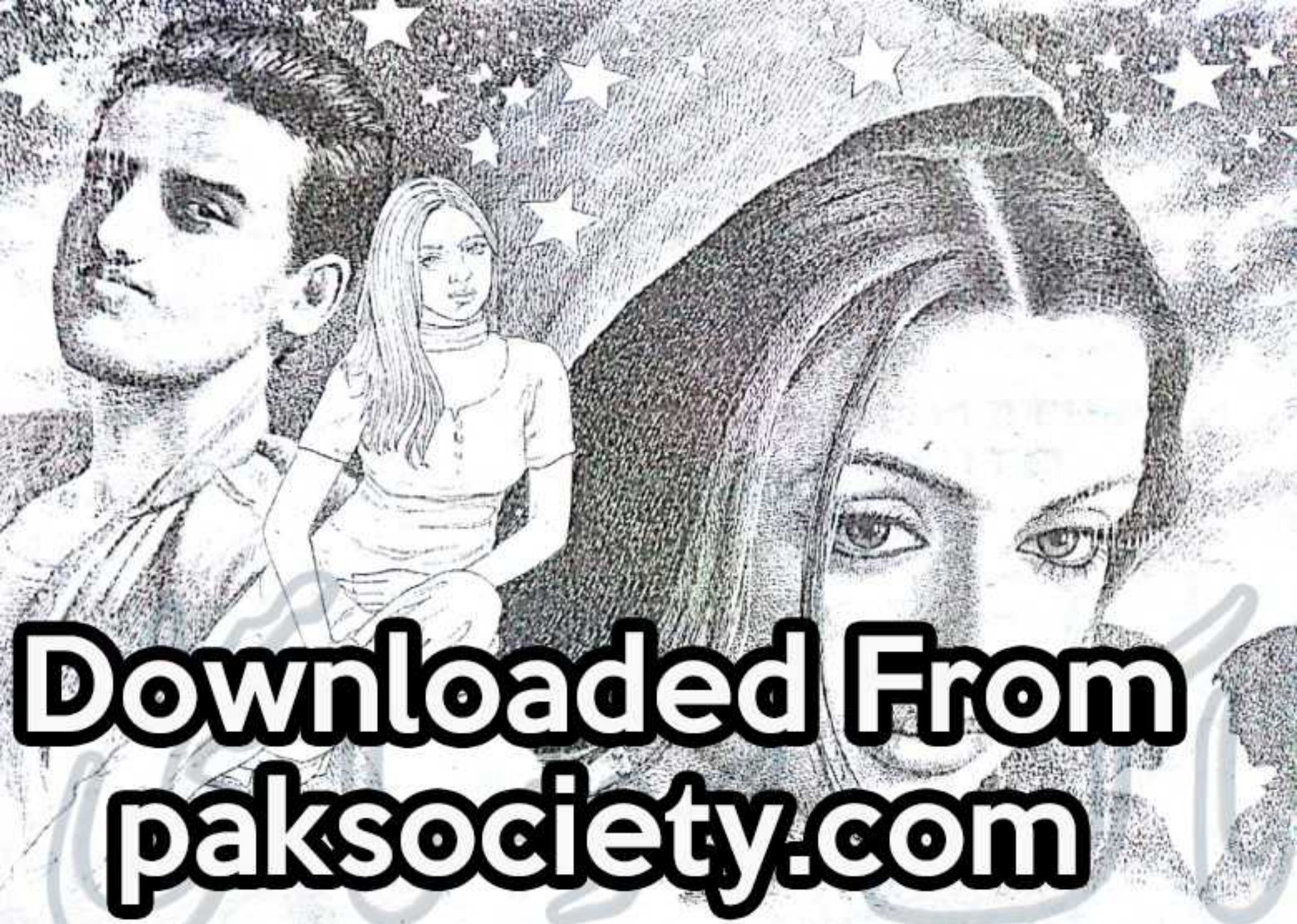




نعمۃ احمد

سلسلہ

فارس غازی انٹیلی جنس کے اعلا عہدے پر فائز ہے۔ وہ اپنے سوتیلے بھائی وارث غازی اور اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں چار سال سے جیل میں قید ہے۔ سعدی یوسف اس کا بھانجا ہے جو اس سے جیل میں ہر ہفتے ملنے آتا ہے۔ سعدی یوسف تین بہن بھائی ہیں ان کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ حنین اور اسامہ سعدی سے چھوٹے ہیں۔ ان کی والدہ ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ چلاتی ہیں۔ زمر سعدی کی پھوپھی ہے۔ وہ چار سال قبل فائرنگ کے ایک واقعہ میں زخمی ہو جاتی ہے۔ فائرنگ کا الزام فارس غازی پر ہے۔ فارس غازی کو شک تھا کہ اس کی بیوی اس کے بھائی کے ساتھ انوالو ہے۔ اس نے جب فائرنگ کی تو زمر اس کی بیوی کے ساتھ تھی۔ فائرنگ کے نتیجے میں بیوی مر جاتی ہے اور زمر شدید زخمی ہو جاتی ہے۔ ایک انگریز عورت اپنا گردہ دے کر اس کی جان بچاتی ہے۔ یقین ہے کہ اس کا ماموں بے گناہ ہے۔ اسے پھنسا یا گیا ہے۔ اس لیے وہ اسے بچانے کی کوشش کرتا ہے جس کی بنا پر زمر اپنے بھتیجے سعدی یوسف سے بدظن ہو جاتی ہے۔ بدظن ہونے کی ایک اور بڑی وجہ یہ ہے کہ زمر جب موت و زندگی کی کشمکش میں ہوتی ہے تو سعدی اس کے پاس نہیں ہوتا۔ وہ اپنی پرہائی اور امتحان میں مصروف ہوتا ہے۔

پڑھو خواتین ڈائجسٹ 190 دسمبر 2015

READING
Section

Downloaded From paksociety.com

مکمل ناول

جواہرات کے دو بیٹے ہیں۔ ہاشم کاردار اور نوشیرواں۔
ہاشم کاردار بہت بڑا وکیل ہے۔ ہاشم اور اس کی بیوی شہین کے درمیان علیحدگی ہو چکی ہے۔ ہاشم کی ایک بیٹی سونیا ہے۔
جس سے وہ بہت محبت کرتا ہے۔
فارس غازی ہاشم کی پیچھو کا بیٹا ہے۔ جیل جانے سے پہلے وہ ہاشم کے گھر میں جس میں اس کا بھی حصہ ہے رہائش پذیر تھا۔ سعدی کی کوششوں سے فارس رہا ہو جاتا ہے۔
والد کے کہنے پر زمر سعدی کی سالگرہ پر اس کے لیے پھول اور ہاشم کی بیٹی سونیا کی سالگرہ کارڈ لے کر جاتی ہے۔ سعدی ہاشم کی بیوی سے ہاشم کے لیپ ٹاپ کا پاس ورڈ مانگتا ہے۔ شہین اپنے دیور نوشیرواں سے جو اپنی بھابھی میں دلچسپی رکھتا ہے بہانے سے پاس ورڈ حاصل کر کے سعدی کو سونیا سالگرہ میں دے دیتی ہے۔
پاس ورڈ ملنے کے بعد سعدی ہاشم کے کمرے میں جا کر اس کے لیپ ٹاپ پہ فلیش ڈرائیو لگا کر ڈیٹا کاپی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

چیف سیکریٹری آفیسر خاور ہاشم کو اس کے کمرے کی فوج دکھاتا ہے جس میں سعدی کمرے میں جاتے ہوئے نظر آتا ہے ہاشم خاور کے ساتھ بھاگتا ہوا کمرے میں پہنچتا ہے لیکن سعدی اس سے پہلے ہی وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔
ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی اس کے کمرے میں لیپ ٹاپ سے ڈیٹا کاپی کرنے آیا تھا اور شہین نے نوشیرواں کو استعمال کر کے پاس ورڈ سعدی کو دیا تھا۔ دوسری جانب بڑے اباز مرکوبہ بتا دیتے ہیں کہ زمر کو کسی یورپین خاتون نے نہیں بلکہ سعدی نے گروہ دیا تھا۔ یہ سن کر زمر کو بے حد دکھ ہوتا ہے۔

نوشیرواں ایک بار پھر ڈر گز لینے لگتا ہے اس بات پر جو اہرات فکر مند ہے۔
بعد میں سعدی لیب ٹاپ پہ فائلز کھولنے کی کوشش کرتا ہے لیکن فائلز ڈیج ہو جاتی ہیں۔
سعدی حنین کو بتاتا ہے کہ وہ گیم کے ہائی اسکورز کی فہرست میں پہلے نمبر پر نہیں ہے، حنین حیران ہو کر اپنی گیم والی سائٹ
کھول کر دیکھتی ہے تو پہلے نمبر ”آئس ایور آفٹر“ لکھا ہوتا ہے۔ وہ علیشا ہے ورجینیا ہے۔ حنین کی علیشا سے
دوستی ہو جاتی ہے۔

اب کہانی ماضی میں آگے بڑھ رہی ہے۔ فارس، زمر سے لاء کی کچھ کلاسز لیتا ہے۔ ندرت اس سے شادی کا پوچھتی
ہیں۔ وہ لا پرواہی سے زمر کا نام لے لیتا ہے۔ ندرت خوش ہو کر ابا سے بات کرتی ہیں۔ ان کی ساس فارس کو اجڈ اور بد تمیز
سمجھتی ہیں اور اس کے مقابلے میں فمد سے زمر کی بات طے کر دیتی ہیں۔ وارث غازی، ہاشم کے خلاف منی لانڈرنگ کیس
کے پر کام کر رہا ہے۔ اس کے پاس مکمل ثبوت ہیں۔ اس کا باس فاطمی ہاشم کو خبردار کر دیتا ہے۔ ہاشم، خاور کی ڈیوٹی لگاتا ہے
کہ وہ وارث کے پاس موجود تمام شواہد ضائع کرے۔ وارث کے ہاشم کے کمرے میں خاور اپنا کام کر رہا ہے۔ جب وارث
ریڈ سگنلز ملنے پر اپنے کمرے میں جاتا ہے۔ پھر کوئی راستہ نہ ہونے کی صورت میں بہت مجبور ہو کر ہاشم، خاور کو وارث کو مار
نے کی اجازت دے دیتا ہے۔ دوسری صورت میں وارث، فارس کو وہ سارے شواہد میل کر دیتا۔ وارث کے قتل کا الزام
ہاشم، فارس پہ ڈلواتا ہے۔

زمر تاشہ کو قتل اور زمر کو زخمی کرنا بھی فارس کو وارث کے قتل کے الزام میں پھنسانے کی ہاشم اور خاور کی منصوبہ بندی
ہوتی ہے۔ وہ دونوں کامیاب ٹھہرتے ہیں۔ زمر تاشہ مرجاتی ہے۔ زمر زخمی حالت میں فارس کے خلاف بیان دیتی ہے۔
فارس جیل چلا جاتا ہے۔ سعدی زمر کو سمجھاتا ہے کہ فارس ایسا نہیں کر سکتا۔ اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ زمر کہتی ہے کہ وہ
جھوٹ نہیں بولتی اور اپنے بیان پر قائم رہتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ زمر
کی ناراضی کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وارث کے قتل کے وقت بھی اس کی شادی لیٹ ہو جاتی ہے اور وہ اپنی شادی
روک کر فارس کے لیے مقدمہ لڑتی ہے۔ اب وہی شخص اپنے اس قتل کو چھپانے کے لیے اسے مارنا چاہتا ہے۔ وہ بظاہر
اتفاقاً ”بیچ جاتی ہے مگر اس کے دونوں گردے ضائع ہو جاتے ہیں۔ اور اس حادثے کی صورت اس کی شادی ٹوٹ جاتی ہے۔
حنین کی نیٹ فرینڈ علیشا دراصل اورنگ زیب کی بیٹی ہے جسے وہ اور ہاشم تسلیم نہیں کرتے۔ وہ باقاعدہ منصوبہ بندی کر
کے حنین سے دوستی کرتی ہے اور پڑھائی کے لیے کاردار سے پیسے کے لیے غنی قانونی پاکستان آتی ہے۔ مگر ہاشم اس سے
بہت برے طریقے سے پیش آتا ہے اور کوئی مدد نہیں کرتا۔ زمر تاشہ اور زمر کے قتل کے وقت فارس اور حنین وارث کیس
کی ایلی بائی کے سلسلے میں علیشا کے پاس ہی ہوتے ہیں مگر علیشا ہاشم کی وجہ سے کھل کر ان کی مدد کرنے سے قاصر
ہے۔

زمر فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ فارس کے خلاف بیان دے گی۔ گھر میں اس فیصلے سے کوئی بھی خوش نہیں، جس کی بنا پر زمر کو
دکھ ہوتا ہے۔

جواہرات، زمر سے ملنے آتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ فارس کے خلاف بیان دے۔ وہ زمر کے ساتھ ہے اسی وقت
زمر کا منگیتر اس کو دیکھنے آتا ہے۔ اس کی ہونے والی ساس یہ رشتہ ختم کرنا چاہتی ہے۔ جواہرات اس کے منگیتر کو اپنی گاڑی
میں بٹھالیتی ہے اور اسے آسٹریلیا بھجوانے کی آفر کرتی ہے۔

سعدی، فارس سے ملنے جاتا ہے تو وہ کہتا ہے ہاشم اس قسم کا آدمی ہے جو قتل بھی کر سکتا ہے اور وہ فارس سے مخلص
نہیں ہے۔

سعدی کو پتا چلتا ہے کہ اسے اسکا لرشپ نہیں ملا تھا۔ زمر نے اپنا پلاٹ بیچ کر اس کو باہر رہنے کے لیے رقم دی تھی۔
اسے بہت دکھ ہوتا ہے۔

زمر کو کوئی گروہ دینے والا نہیں ملتا تو سعدی اسے اپنا گروہ دے دیتا ہے۔ وہ یہ بات زمر کو نہیں بتاتا۔ زمر بدگمان ہو جاتی
ہے کہ سعدی اس کو اس حال میں چھوڑ کر اپنا امتحان دینے ملک سے باہر چلا گیا۔

سعدی، علیشا کو راضی کر لیتا ہے کہ وہ یہ کہے گی کہ وہ اپنا گروہ زمر کو دے رہی ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر زمر کو پتا چل گیا کہ گروہ سعدی نے دیا ہے تو وہ کبھی سعدی سے گروہ لینے پر رضامند نہیں ہوگی۔

ہاشم حنین کو بتا دیتا ہے کہ علیشا نے اورنگ زیب کا ردِ ارتکب پہنچنے کے لیے حنین کو ذریعہ بنایا ہے۔ حنین اس بات پر علیشا سے ناراض ہو جاتی ہے۔

ہاشم، علیشا کو دھمکی دیتا ہے کہ وہ اس کی ماں کا ایکسیڈنٹ کروا چکا ہے اور وہ اسپتال میں ہے۔ وہ علیشا کو بھی مروا سکتا ہے۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ اور اس کی ماں بھی امریکن شہری ہیں۔

جواہرات، زمر کو بتاتی ہے کہ زمر کا منگیتر حماد شادی کر رہا ہے۔

فارس کہتا ہے کہ وہ ایک بار زمر سے مل کر اس کو بتانا چاہتا ہے کہ وہ بے گناہ ہے۔ اسے پھنسا یا جا رہا ہے۔ وہ ہاشم پر بھی شبہ ظاہر کرتا ہے، لیکن زمر اس سے نہیں ملتی۔

ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی اس کے کمپیوٹر سے ڈیٹا چرا کر لے جا چکا ہے۔ وہ جواہرات سے کہتا ہے کہ زمر کی شادی فارس سے کرانے میں خطرہ ہے، کہیں وہ جان نہ جائے کہ فارس بے گناہ ہے، لیکن وہ مطمئن ہے۔ جواہرات، زمر کو بتاتی ہے کہ فارس نے اس کے لیے رشتہ بھجوا دیا تھا، جسے انکار کر دیا گیا تھا۔ زمر کو یقین ہو جاتا ہے کہ فارس نے اسی بات کا بدلہ لیا ہے۔ زمر، جواہرات کے اکسانے پر صرف فارس سے بدلہ لینے کے لیے اس سے شادی پر رضامند ہو جاتی ہے۔

ڈیڑھ ماہ قبل ایک واقعہ ہوا تھا جس سے سعدی کو پتا چلا کہ ہاشم مجرم ہے۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ نوشیرواں نے ایک ڈراما کیا تھا کہ وہ کوریا میں ہے اور اغوا ہو چکا ہے۔ تاوان نہ دیا گیا تو وہ لوگ اس کو مار دیں گے۔

ہاشم، حنین اور سعدی کو آدھی رات کو گھربلاتا ہے اور ساری پجوشن بتا کر اس سے پوچھتا ہے، کیا اس میں علیشا کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔

وہ حنین سے کہتا ہے کہ تم اس کے بارے میں پتا کرو۔ حنین کمپیوٹر سنبھال لیتی ہے۔ سعدی اس کے ساتھ بیٹھا ہوتا ہے۔ تب ہی ہاشم آکر اپنا سیف کھولتا ہے تو سعدی کی نظر پڑتی ہے۔ اس کو جو کچھ نظر آتا ہے اس سے اس کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔

اس میں وارث کی بیٹیوں کی تصویر ہوتی ہے۔ جو وارث ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ وہ ہاشم کے سیف کے کوڑا آئینے میں دیکھ لیتا ہے اور کمرے سے اس کے جانے کے بعد سیف کھولتا ہے۔ اس سے ایک لفافہ ملتا ہے جس میں اس ریسٹورنٹ میں فائرنگ کے فوراً بعد کی تصویر ہوتی ہے، جس میں زمر خون میں لت پت نظر آتی ہے اور ایک فلیش ڈرائیو بھی ملتی ہے۔

تب اسے پتا چلتا ہے کہ ہاشم مخلص نہیں تھا۔ یہ قتل اسی نے کرایا تھا۔

حنین، نوشیرواں کی پول کھول دیتی ہے، وہ کہتی ہے کہ نوشیرواں پاکستان میں ہی ہے اور اس نے پیسے اینٹھنے کے لیے اغوا کا ڈراما رچایا۔

سعدی وہ فلیش سنتا ہے تو سن رہ جاتا ہے۔ وہ فارس کی آواز کی ریکارڈنگ ہوتی ہے۔ جس میں وہ زمر کو دھمکی دیتا ہے۔ سعدی بار بار سنتا ہے تو اسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ جعلی ہے۔ وہ فارس کے وکیل کو فارغ کر دیتا ہے۔ جو ہاشم کا آدمی تھا۔

سعدی، زمر کے پاس ایک بار پھر جاتا ہے اور اسے قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ فارس بے گناہ ہے۔ وہ کہتا ہے اس میں کوئی تیسرا آدمی بھی ملوث ہو سکتا ہے۔

”مثلاً کون؟“ زمر نے پوچھا۔

”مثلاً... مثلاً“ ہاشم کا ردِ اہ۔ ”سعدی نے ہمت کر کے کہہ ڈالا۔ زمر سن رہی ہو گئی۔

زمر کو ہاشم کا ردِ اہ کے ملوث ہونے پر یقین نہیں آتا سعدی زمر سے کسی اچھے وکیل کے بارے میں پوچھتا ہے تو وہ رہبان خلعی کا نام لیتی ہے۔ سعدی فارس کا وکیل بدل دیتا ہے۔

حنین علیشا کو فون کرتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ وہ جیل میں ہے کیونکہ اس نے چوری کی کوشش کی تھی۔ ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی نے وہ آڈیو حاصل کر لی ہے جس میں فارس کا جعلی فون ٹیپ ہے لیکن وہ مطمئن ہے کہ جج تو ان کا ہے۔

ہاشم کی بیوی شہین ایک کلب میں جوا کھیلتی ہے اس کی سی سی ٹی وی فوٹیج ان کے کیمروں میں ہے۔ اسے غائب کرانے کے لیے سعدی کی مدد دیتی ہے۔

ریحان خلجی عدالت میں زمر کو جواب کر دیتا ہے۔ یہ بات فارس کو اچھی نہیں لگتی۔ فارس جیل سے نکلنا چاہتا ہے لیکن اس کا ساتھی غلطی سے زمر کو اس میں استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ زمر کا غصہ فارس کے خلاف مزید بڑھ جاتا ہے۔ زمر فارس سے ملتی ہے تو فارس کہتا ہے کہ ایک بار وہ اس کے کیس کو خود دیکھے۔ فارس کہتی ہے کہ وہ زمر سے معافی نہیں مانگے گا۔

جیل سے علیشا حنین کو خط لکھتی ہے وہ حنین سے کہتی ہے تم میں اور مجھ میں ذہانت کی علاوہ ایک اور چیز مشترک ہے وہ ہے ہماری برائی کی طرف مائل ہونے والی فطرت۔ اس لیے کسی کی کمزوری کو شکار مت کرنا۔ گناہ مت کرنا ورنہ کفارے دیتے عمر بیت جائے گی۔

حنین کو اپنا ماضی یاد آ جاتا ہے جب اس نے کسی کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا تھا اور وہ شخص صدمہ سے دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ وہ کفارہ کے لیے آگے پڑھنے سے انکار کر دیتی ہے۔ وہ سعدی کو یہ ساری بات بتاتی ہے تو سعدی کو شدید صدمہ ہوتا ہے۔

اورنگ زیب نوشیرواں کو عاق کرنا چاہتے ہیں۔ یہ جان کر جواہرات غصہ سے پاگل ہو جاتی ہے۔ وہ اورنگ زیب کو قتل کر دیتی ہے اور ڈاکٹر سے مل کر اسے بلیک میل کر کے پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی اپنی مرضی کی حاصل کر لیتی ہے۔ زمر فارس کی طرف سے مشکوک ہے۔ وہ اسے تہ خانے میں بنے کمرے میں جانے سے منع کرتا ہے لیکن زمر نہیں مانتی وہ کمرے میں جاتی ہے تو وہ دیوار پر کچھ تصویریں لگی دیکھتی ہے یہ وہ لوگ ہیں جو فارس کے مجرم ہیں۔

جسٹس سکندر (فارس کے کیس کے جج) وارث غازی کا باس الیاس فاطمی ڈاکٹر توقیر بخاری ڈاکٹر ایمین بخاری (فارس کی سائیکا لوجسٹ) اور دوسرے لوگ۔ فارس کہتا ہے کہ وہ ان سب سے اپنے ساتھ کی گئی نا انصافی کا انتقام لے گا۔ سعدی جب نوشیرواں سے ملنے جاتا ہے تو ڈاکٹر سارہ کو ساتھ لے جاتا ہے۔ سعدی کو امید ہے کہ ڈاکٹر سارہ نے سب کو بتا دیا ہو گا۔

ہاشم نے حنین سے وہ یو ایس بی مانگی جو سعدی نے اس کے لیپ ٹاپ سے چرائی تھی۔ حنین نے دے دی تو زمر اور فارس کو بہت غصہ آتا ہے لیکن حنین بتاتی ہے کہ اس نے اصلی یو ایس بی نہیں دی تھی۔

ہارون عبید مشہور سیاست دان جواہرات کے حسن کے اسیر ہیں۔ وہ ایک اسے ہیرا تحفہ میں دیتے ہیں۔ زمر احمر کو اپنا کوئی کام کرنے کے لیے کہتی ہے۔ احمر ہارون عبید کی الیکشن کمپین چلا رہا ہے۔ آب دار ہارون عبید کی بیٹی ہے جو سعد کے ساتھ پڑھتی رہی ہے۔

فارس زمر سے کہتا ہے کہ اس نے تین وجوہات کی بنا پر زمر سے شادی کی ہے۔ (1) زمر کے والد کے احسانات (2) شادی کر کے وہ سب کو یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ وہ سب کچھ بھول کر نئی زندگی شروع کر چکا ہے۔

تیسری وجہ وہ زمر کے اصرار کے باوجود نہیں بتاتا۔ حنین ہاشم کے بارے میں زمر کو بتا دیتی ہے۔ زمر کسی تاثر کا اظہار نہیں کرتی لیکن اسے ہاشم پر بہت غصہ ہے۔ زمر اسے اپنے جرم کے بارے میں بتاتی ہے تو زمر کہتی ہے کہ ایک اوی پی ایک معمولی سی لڑکی کو دھمکی سے بلیک میل نہیں ہو سکتا۔ اس کی موت کسی اور وجہ سے ہوئی ہے۔

سعدی کی یاد میں ایک تقریب منعقد کی گئی ہے، جہاں احمر شفیق، ڈاکٹر ایمین بخاری اور ڈاکٹر توقیر بخاری بھی شریک ہیں۔
 زمر اور فارس، حنین کو تقریر کرنے کا کہہ کر باہر نکل آتے ہیں۔
 ڈاکٹر ایمین بخاری اور ڈاکٹر توقیر بخاری کا نیا تعمیر شدہ شان دار اسپتال جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ فارس اور زمر واپس تقریب میں آ جاتے ہیں۔

حنین اور زمر ہاشم کی سیکرٹری حلیمہ کا نام سن کر چونک جاتی ہیں۔
 ہاشم سعدی سے کہتا ہے کہ حنین اس کے کہنے پر اس سے ملنے ہوٹل آرہی ہے۔ سعدی پریشان ہو جاتا ہے، پھر ہاشم اس کو فون پر حنین کا پروفائل دکھاتا ہے، تب وہ جان لیتا ہے کہ حنین چھ منٹ پہلے قرآن پاک کی وہ آیت پڑھ چکی ہے جو اس نے اپنے کمپیوٹر میں لوڈ کی تھی۔ سعدی پورے یقین سے کہتا ہے کہ ”حنین ہاشم سے ملنے نہیں آئے گی۔“ اور واقعی ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہاشم تلملا کر رہ جاتا ہے۔

جسٹس سکندر کی ایک ویڈیو جس میں وہ اوسی پی کو قتل کر رہے ہیں۔ ٹی وی چینل پر چل جاتی ہے۔ یہ وہی ویڈیو ہے جو سعدی نے اوسی پی کے گھر سے حاصل کی تھی۔
 زمر ڈاکٹر کے پاس جاتی ہے تو اس کو پتا چلتا ہے کہ اس کا واحد گروہ جو سعدی نے دیا تھا۔ ناکارہ ہو چکا ہے۔

Downloaded From
 pak society.com
 ستر سہول قسط ۱۷

آدمی کے دو دل

ساری امیدیں ترک کر دو، اے اندر داخل ہونے والے!

میں نے دیکھے یہ الفاظ افسردہ رنگ میں لکھے
 جنم کے دروازے کی چوٹی پہ
 پوچھا ”ان کا مطلب کھن ہے میرے لیے اے استاد“

اور کسی تجربہ کار کی طرح در جل بولا
 ”یہاں تمام شک ترک کر دیا جانا چاہیے
 یہاں ساری بزدلی مٹا دینی چاہیے۔“

ہم اس جگہ آچکے ہیں
 کیا تھا جس کا ذکر میں نے تم سے
 تم دیکھو گے یہاں دردناک لوگوں کو
 جو حکمت، خیر سے محروم ہو چکے ہیں۔“
 یہ کہہ کر تھا اس نے میرا ہاتھ محفوظ انداز میں
 اور جب مجھے کچھ اطمینان ہوا تو وہ

لے گیا مجھے پُر اسرار جگہ کے اندر
 وہاں آہوں کا شکایات بمین
 گونجتے تھے بنا ستارے کی ہوا میں
 ان کو سن کر اسی جگہ
 میں بہت رویا!
 مختلف زبانیں بولیاں خوفناک
 غصے کے تلفظ، درد کی باتیں
 اونچی سرکش آوازیں، ساتھ ہاتھوں کی دھمک
 کسی گولے کی طرح اس سیاہ!
 دانگی ہوا میں گھوم رہی تھیں
 اور میں جس کا سر خوف سے بندھا تھا بولا
 ”اے استاد، یہ کیا سنتا ہوں میں؟
 کون ہیں یہ درد سے مغلوب لوگ؟“
 وہ کہنے لگا مجھ سے
 ”اس بد بخت طریقے سے رکھی گئی ہیں
 ان لوگوں کی اداس رو میں جو
 رہتے تھے بدنامی یا نیک نامی کے بغیر۔“

نہ یہ باغی تھے خدا سے

نہ ہی وفادار تھے اس کے

بلکہ جیتے تھے صرف اپنی ذات کے لیے

جنتوں نے ان کو نکال دیا کہ انصاف کم نہ ہو جائے
اور جہنم کے نچلے گڑھے ان کو لینے پر راضی نہیں
کہ جہنمیوں کو ان سے کوئی شان نہیں مل سکتی

دنیا ان کو اب کوئی شہرت نہیں دے گی

راحت اور انصاف دونوں ان کو حقیر سمجھتے ہیں

سوان سے مخاطب نہ ہو بس دیکھو اور گزر جاؤ۔“

پولیس موبائلز کی نیلی سرخ بتی جل بجھ رہی تھی۔
الہکار، چٹکری لگے فارس کو ایک دین میں بٹھا رہے
تھے۔

”مسز زمر! ہمیں گھر کی تلاشی لینی ہے۔“ سرد شاہ
نے قریب کھڑی لیڈی پولیس الہکاروں کی طرف اشارہ
کرتے اسے مخاطب کیا۔ زمر کا ذہن مفلوج تھا۔ اس
نے لیڈیز الہکاروں کو دیکھا پھر اے ایس پی کو۔ ذہن
بیدار ہونے لگا۔ اس نے ایک ہاتھ دروازے کی تاب
اور دوسرا چوکھٹ کی لکڑی۔ جمایا۔ سفید پڑتے چہرے
کو سخت بنانے کی کوشش کی مگر جب بولی تو آواز میں
لرزش تھی۔

”اتنے سال جتنے کام کیے ہیں میں نے آپ کے یا
آپ نے میرے کیا ان میں سے کوئی اس قاتل ہے کہ
آپ ہمارے گھر داخل نہ ہوں؟“

”مسز زمر! میرے پاس سرچ وارنٹ ہے، لیکن
ابھی مجھے یاد آیا کہ مجھے اپنے بیٹے کو دس منٹ کی کل
کرنی ہے“ سختی سے کہتے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔
”دس منٹ بعد میں آپ کے گھر میں داخل ہوں گا۔“

زمر نے جلدی سے اثبات میں سر ہلاتے دروازہ بند
کر دیا۔ پھر مڑی تو دھکا سا لگا۔ سامنے حنین اور سیم
کھڑے تھے خوف زدہ پریشان۔

”وہ ماموں کو لے گئے زمر؟ اب کیا ہو گا؟“ حنین

بہت ڈر گئی تھی۔ سیم کو کہنی سے پکڑ رکھا تھا۔ زمر
آگے آئی۔ حنین کی آنکھوں میں دیکھا۔

”حنین! پولیس نے ہمیں دس منٹ دیے ہیں۔ پھر
وہ گھر کی تلاشی لیں گے۔“

”اوہ گاڈ۔“ حنین نے سیم کی کہنی چھوڑی۔

”سمنٹ۔ ہمارے کاغذ۔ ہمارے لیپ ٹاپس، موبائلز
ان کو عائب کیسے کریں؟“

”اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“ زمر سیم کے
پاس آئی جو بالکل چپ الجھا ہوا کھڑا تھا۔ زمر نے اس
کے دونوں ہاتھ تھامے۔ اس کے ہاتھ سرد تھے، سیم
کے گرم تھے۔

”آپ خوف زدہ ہیں، پھپھو؟“

زمر نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے نم آنکھوں سے
سر ہلایا۔ ”میں بہت بہت خوف زدہ ہوں۔“

”میں آپ کے ساتھ ہوں، آپ مت ڈریں!“ وہ
فکر مندی سے بولا تھا۔

”سیم۔ میری بات سنو!“ وہ بے ربط سانسوں کے
درمیان کہہ رہی تھی۔ ”سعدی نہیں ہے، فارس بھی
نہیں ہے، اس گھر میں کوئی مرد نہیں ہے، سوائے۔۔۔
سوائے تمہارے۔ اسامہ! تم آج سے اس گھر کے
بڑے مرد ہو۔ میری آنکھوں میں دیکھ کر کہو کہ تم اس
گھر کے بڑے مرد ہو۔“

”میں اس گھر کا بڑا مرد ہوں۔“ اس نے زمر کے
ہاتھ تھامے دہرایا۔

”اوکے!“ اس نے چند گہرے سانس لیے۔ ”اب
تم کچن کی کھڑکی سے باہر کو دو، پولیس تمہیں نہیں
روکے گی۔ ہاسٹم کی بالکونی میں جاؤ۔ دروازہ کھٹکھاؤ۔
دروازے کا شیشہ ان بریک ایبل (نہ ٹوٹنے والا) ہے۔
لیکن اگر وہ نہ کھولے تو تم گملا اٹھا کر اس کے دروازے
پر تب تک مارتے رہو جب تک وہ نکل نہیں آتا۔
جب وہ نکلے، تو تم اس کو کہو گے کہ زمر آپ کو بلا رہی
ہیں۔ اور اسامہ! تم اس کو لیے بغیر واپس نہیں آؤ
گے۔“

اسامہ ہاتھ چھڑا کر کچن کی طرف بھاگا۔ زمر نے بے

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیرائل

SOHNI HAIR OIL

✽ کرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے

✽ بال اگاتا ہے

✽ بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے

✽ مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے

یکساں مفید

✽ ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے



قیمت - 120/- روپے

سوہنی ہیرائل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے جس کی تیاری

کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے یہ بازار میں

یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خریدنا جاسکتا ہے ایک

بوتل کی قیمت صرف - 120/- روپے ہے، دوسرے شہروں والے مٹی آڈر بھیج

کر جٹر پارسل سے منگوائیں، رجسٹری سے منگوانے والے مٹی آڈر اس

حساب سے بھجوائیں۔

2 بوتلوں کے لئے 300/- روپے

3 بوتلوں کے لئے 400/- روپے

6 بوتلوں کے لئے 800/- روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارج شامل ہیں۔

مٹی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53- اورنگزب مارکیٹ، سیکٹر فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیرائل ان جگہوں

سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53- اورنگزب مارکیٹ، سیکٹر فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی

فون نمبر: 32735021

اختیار کپٹی مسلی۔ فارس کی بے یقینی، ایک دم اتنی ساری پولیس کی نفری کا ان کے سامنے ہوتا، جیسے حملہ کرنے کو تیار ہوں، ابا کی غیر موجودگی وہ طے نہیں کر سکی کہ کیا زیادہ بھیانک تھا۔

دس منٹ بعد دروازہ بجنے لگا۔ زمر نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھا۔ سامنے سیم کے ساتھ ہاشم چلتا آ رہا تھا، ایسے کہ سیم نے اس کی آستین کلائی سے پکڑ رکھی تھی۔

”شکر۔۔۔ آپ آگئے ہاشم!“ اس نے دروازہ کھول دیا۔ ہاشم پریشانی اور قدرے غصے سے پولیس اہلکاروں کو دیکھتے ان تک آیا۔

”زمر! کیا ہو رہا ہے یہ؟ فارس کو اریسٹ کر کے لے گئے وہ؟ مجھے پہلے کیوں نہیں بلایا؟ اور اس کو گرفتاری کیوں دینے دی ہاں؟“ زمر کے پیچھے کھڑی حنین بس اس کو دیکھ کر رہ گئی۔ (تم قتل کرو ہو یا کرامات کرو ہو؟)

”ہاشم! مجھے خود نہیں معلوم، سب بہت جلدی میں ہوا۔“ زمر نے ان دونوں کو اندر آنے دیا اور دروازہ بند کر دیا۔ اے ایس پی اب سائرن پہ ان کو دروازہ کھولنے کا کہہ رہا تھا۔

”ان کو میرے گھر سے نکال لے ہاشم! کسی بھی طرح۔ یہ یہاں سے کچھ بھی لیے بغیر جائیں گے۔ پلیر!“ اس کی آنکھوں میں التجا تھی۔ ہاشم نے سمجھ بھر کو ان آنکھوں میں دیکھا اور پھر واپس باہر نکل گیا۔ سیم بھی ساتھ گیا۔ زمر اور حنین اوپچی کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھنے لگیں۔

ہاشم اے ایس پی سے نشی سے کچھ کہہ رہا تھا، وہ نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ ہاشم نے موبائل پہ نمبر ملا کر چند انفاظ کہے اور پھر فون اے ایس پی کو دیا۔ وہ متذبذب سا (اس امر سے ناواقف کہ جسٹس سکندر کی طرف سے آنے والے احکامات اسی شخص کے ہوتے ہیں) فون پہ ایس سر ایس سر کرتا رہا پھر ناخوشی سے فون ہاشم کو نہ لایا اور اہلکاروں کو اشارہ کیا۔ ہاشم اب سختی سے ان کو باہر دفعتان ہونے کا کہہ رہا تھا۔

”ہاشم ہماری مدد کیوں کر رہے ہیں؟“

”کیونکہ ہم باتیں چھپانے کی غلطی کرتے ہیں۔ ہم نے فارس کو یہ سب نہ بتا کر غلطی کی ہے۔“

”پھر اب ہم کیا کریں؟“

زمر نے گہری سانس لی، بالوں سے پونی کھینچ کر اتاری اور ان کو جوڑے میں لپیٹتے اٹھی۔ ”پھر یہ کہ ہم اپنی غلطیوں کو ٹھیک کریں!“ رنگت ابھی تک پجڑی ہوئی تھی۔

”مگر کیسے؟ ماموں پھر سے جیل چلے گئے، ہم پھر سے وہیں آگئے، سب ساڑھے چار سال پہلے جیسا ہو رہا ہے۔“

”کچھ بھی ویسا نہیں ہے۔“ وہ موبائل پر احمر کا نمبر ملاتے ہوئے بولی تھی۔



حاصل ہوا ہے کیا مجھے اس بھاگ دوڑ میں سب منزلوں کو پا کے بھی رسوا تھا میں بڑا ہارون عبید کی رہائش گاہ کے ڈرائنگ روم میں انٹرویو کی نشست ہو رہی تھی۔ کیمروں کی روشنی۔ ٹاک شو کا عملہ۔ وہ مدہم اور شائستہ انداز میں اینکرو پر سن کو سوال کا جواب دے رہے تھے۔ کونے میں کھڑا احمر اپنے ٹیپ سے چند پوائنٹس کو چیک کر رہا تھا جب اس کا فون تھر تھرایا۔ اس نے نکال کر دیکھا۔ زمر۔ موقع محل نہیں تھا۔ سائلینٹ کر دیا۔ ایک، دو، تیسری دفعہ بیل آئی تو وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔

”سوری میں ذرا۔۔۔“

”احمر! فارس اریسٹ ہو گیا ہے۔“ وہ بے ربط سانسوں کے درمیان بولتی جا رہی تھی اور وہ حق دق سن رہا تھا۔

”بے فکر رہے میں کچھ کرتا ہوں۔ نہیں تمھانے نہیں جاؤں گا، جا بھی نہیں سکتا۔ میں عبید صاحب سے کہہ کر کسی کو فون کرواتا ہوں۔“

زمر کو ڈر تھا کہ فارس اس کو دیکھ کر غصہ نہ ہو جائے، وہ نہ کہتی تب بھی اس کا نکلنا ممکن تھا۔ بریک کا وقفہ جیسے ہی لیا گیا، وہ ہارون کے پاس آیا،

”اس نے ہمیشہ کی طرح یہ ثابت کرنا ہے کہ وہ ہمارا سب سے بڑا مخلص ہے۔“ زمر سرگوشی میں بولی۔ نظریں وہیں جبی تھیں۔ سیم بھی سنجیدہ سا وہیں کھڑا تھا۔ اس دن لگاؤ بڑا ہو گیا ہے۔ سعدی کی طرح۔

الہکار اب واپس جا رہے تھے، ان کو گھر سے کچھ نہیں ملا، یہی لکھنا تھا اب۔ پھر ہاشم اندر آیا۔

”پولیس اب آپ کو تنگ نہیں کرے گی، میں نے ان کا دماغ درست کر دیا ہے لیکن یہ قمر الدین چوہدری کون ہے؟“ اس نے نا سمجھی سے زمر کو دیکھتے پوچھا۔ اس نے تکان سے شانے اچکائے۔

”مجھے کچھ نہیں پتا۔ فارس تو یہ سمجھ رہا ہے کہ اسے اس کیس میں میں نے پھنسا دیا ہے!“

”اوہو!“ اس نے افسوس کیا۔ ”آپ لوگ ہماری طرف آجائیں، یہاں اکیلے رہنا درست نہیں۔“

”نہیں ہاشم! ہم ٹھیک ہیں۔ گھر کے باہر آپ کے گارڈز ہیں نا۔ ہمیں کس کا ڈر ہو گا۔“ بہت ممنونیت سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”اور جو آج رات آپ نے کیا اس کا بدلہ میں کیسے اتار پاؤں گی!“

”ایسے مت کہیں ہم فیملی ہیں۔“ وہ نرمی سے بولا پھر گھڑی دیکھی۔ ”مجھے ایک ڈنر پہ جانا ہے، آریو شیور، آپ لوگ ادھر ٹھیک ہیں؟“

”ہم ٹھیک ہیں۔“ حنین پہلی دفعہ بولی، وہ بھی بے رخی سے۔ ہاشم نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا، ہلکا سا مسکرایا اور سر کو خم دیا۔ حنین کے دل میں کچھ ڈوب گیا تھا۔ بہت عرصے بعد ”نگاہ“ ملی تھی۔ آہ! وہ کرامات کر کے قتل کرتا تھا!

اس کے جاتے ہی اسامہ سارے دروازے، کھڑکیاں بند کرنے لگا۔ بولٹ کنڈیاں، لاکس، ایک کے بعد ایک چڑھانے لگا۔ وہ دونوں وہیں صوفے پہ بیٹھ گئیں۔ تھکی تھکی پریشان۔

”ماموں آپ کو الزام کیوں دے رہے تھے؟“ حنہ کو یاد آیا۔ زمر نے افسردہ نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

”کاردارز کامیاب اس لیے ہوتے ہیں کیونکہ وہ ایک دوسرے کو سب بتاتے ہیں اور ہم ناکام اس لیے

اور جھک کر سرگوشی میں اپنے دوست فارس غازی کی گرفتاری کا مڑہ کہہ سنایا۔ ”سر! آپ ایک کال کر دیں تو وہ اس پہ پرچا نہیں کاٹیں گے۔“

ہارون نے بے نیاز نگاہ اس پہ ڈالی۔ شلوار سوٹ میں ملبوس وہ تمکنت کے ساتھ اونچی کرسی پہ بیٹھے تھے۔ ”اوکے میں صبح دیکھتا ہوں۔“

احمر کی آنکھوں میں بے چینی پھیلی۔ ”سر! صبح تک دیر ہو جائے گی ایک دفعہ پرچا کٹ گیا تو وہ پھنس جائے گا۔“

”احمر! انہوں نے ٹھنڈی سی نظر اس پہ ڈالی۔ میں نے کہانا میں صبح دیکھوں گا۔“

احمر پر اس پڑ گئی۔ ”جی بہتر۔“ سنجیدگی سے سیدھا ہوا اور کونے میں جا کھڑا ہوا۔ اب میک اپ گرل بریک کے دوران ہارون صاحب کے بال ٹھیک کر رہی تھی، الینکو موبائل پہ بات کر رہا تھا، کیمرہ مین اور دو افراد کسی بات پہ بحث کر رہے تھے اس سارے شور میں اسے اپنا آپ کسی کمی کین نوکر سے برہ کر نہیں لگ رہا تھا۔

خفگی سے گردن موڑی تو کھڑکی سے باہر نیم تاریک لان میں وہ چلتی نظر آئی۔ گاڑی کے ساتھ کھڑی وہ بیک اور بلی کی باسکٹ اپنی نگرانی میں اندر رکھوا رہی تھی۔ احمر کو روک سنی کی کرن نظر آئی۔ وہ تیزی سے باہر بھاگا۔ ”آپ میرا ایک کام کر سکتی ہیں؟“ عقب میں آکر پکارا تو آبی اپنی ایزیوں پہ کھوی۔ اسے دیکھ کر آنکھوں میں شک و شبہ ابھرا۔ ”کیا کام؟“

”آپ مجھے ناپسند کرتی ہیں اور میرے کام کو بھی جو واقعی شاید کوئی اچھا کام نہیں ہے۔“ وہ ایسے پہلے کبھی نہیں بولا تھا۔ آبی کے ماتھے کے بل غائب ہونے لگے۔ ”کیا ہوا ہے؟“

”میرا دوست فارس غازی وہ بے قصور ہے اور پولیس اس کو گرفتار۔“ چند الفاظ اس نے پھولی سانسوں میں ادا کیے۔ ہارون کی بے حسی کا بھی نہ چاہتے ہوئے شکوہ کر گیا۔ ابدار بالکل سن ہو گئی۔ ”مجھے یقین ہے اس کو ان ہی لوگوں نے پھنسا

ہے جنہوں نے سعدی کے ساتھ یہ سب کیا ہے۔ مگر یہ بہت غلط ہو رہا ہے۔“

”آپ اندر جائیں احمر صاحب! میں کر لوں گی۔“ وہ سنجیدگی سے بولی تھی اور اس کی آنکھوں میں کوئی عجیب بے بس غصہ بھی تھا جو احمر نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔

تھانے کا پوچھ کر چند مزید سوال کر کے وہ تیزی سے آگے برہہ گئی۔ احمر پہلے سے زیادہ پریشان نظر آنے لگا تھا۔ معلوم نہیں اس نے ٹھیک کیا یا غلط۔



جس طرح ترک تعلق پہ ہے اصرار اب کے ایسی شدت تو میرے عہد وفا میں بھی نہ تھی رات ہر بل مزید سیاہ اور سرد ہوتی جا رہی تھی۔ زمر کو اس کمرے میں بیٹھے کافی دیر ہو گئی جب اہلکار فارس کو لے کر آئے۔ زمر نے نگاہ اٹھا کر اس کو دیکھا۔ فارس بس ایک تیز نظر اس پہ ڈالتا سامنے رکھی کرسی پہ بیٹھ گیا۔

”ہینڈ کفس!“ زمر نے اشارہ کیا۔ ایک اہلکار نے آگے برہہ کر اس کی جھکڑی کھول دی۔

”آپ اپنے کلائنٹ سے بات کر سکتی ہیں۔“ ایس آئی جو اس کیس کا آئی او (آئی فیشی افسر) بھی تھا کمرے سے نکل گیا۔ دروازہ بند ہوا تو خاموشی چھا گئی۔ ”آپ کو یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟ حنہ اور سیم کو اکیلے چھوڑ کر؟“ وہ درشتی سے گویا ہوا۔

”وہ گاڑی میں ہیں۔ ان کی ذمہ داری میرا مسئلہ ہے میں اٹھالوں گی۔“ پرس سے دو کاغذ نکال کر اس کے سامنے کیے۔

”یہ تمہارے لیگل رائٹس ہیں یاد دہانی کے لیے ان کو پڑھ لو۔ پولیس کے کسی سوال کا جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ صبح وہ تمہیں عدالت میں پیش کر کے جسمانی رہمائڈ لیں گے۔“

”زمر بی بی! مجھے اپنے تمام حقوق معلوم ہیں۔“ فارس نے اس کی آنکھوں میں برہمی سے دیکھا۔ ”اور

آپ میری وکیل نہیں ہیں اس لیے فکر نہ کریں۔
 ”تم چاہو یا نہ چاہو میں تمہاری وکیل ہوں۔“
 ”مجھے مقدمے میں پھنسا کر آپ مجھے نکلوانے کی
 کوشش کا دکھاوا کر کے سب کی نظروں میں معتبر بننا
 چاہتی ہیں جانتا ہوں۔“

”فارس! میں نے یہ نہیں کیا تمہارے ساتھ!“ وہ
 تحمل سے بولی۔ وہ ہریات کی تیاری کر کے گھر سے نکلی
 تھی۔ ”تمہارے ہر الزام کا جواب ہے میرے پاس“
 لیکن میں یہاں وضاحتیں دینے نہیں آئی۔ تمہیں یہ یاد
 دلانے آئی ہوں کہ ہم ایک ٹیم تھے اور ٹیم ہیں۔“
 وہ اسی طرح چبھتی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔
 ”مجھے آپ کے ایک لفظ پر بھی اعتبار نہیں ہے۔“
 زمر نے ضبط کی کوشش کرتے گہری سانس لی اور
 اٹھی۔ ”میں جانتی ہوں تم بے گناہ ہو تم تو شاید اس
 مقتول کو جانتے بھی نہیں کجایہ کہ۔“
 ”میں اس کو جانتا بھی تھا اور جیل میں اس کو دو دفعہ
 پٹا بھی ہے۔ خوش؟“ وہ بھی کھڑا ہوا۔ زمر بس اس کو
 دیکھ کر رہ گئی۔

”اس لیے زمر بی بی۔ آپ میری وکیل نہیں ہیں۔
 صبح کورٹ آنے کی زحمت مت کیجیے گا۔“
 ”اپنے رائٹس پڑھو اور خاموش رہنا۔“ وہ پرس
 اٹھاتی اس کو خفا نظروں سے دیکھتی باہر نکل گئی۔
 زمر جس لمحے گاڑی میں آکر بیٹھی تھی قریب میں
 ایک لش چمکتی کار آرکی۔

ڈرائیور نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا اور اندر سے
 آبدار نکلی۔ سرخ اسکارف چہرے کے گرد کندھے پہ
 بسی چین کے پرس پہ ہاتھ رکھے وہ۔ سوٹ میں
 ملبوس ملازم کے ساتھ سیدھی آگے چلتی گئی۔



ترک دنیا کا سماں، ختم ملاقات کا وقت
 اس گھڑی اے دل آوارہ کہاں جاؤ گے؟
 فارس کو دوبارہ لاک اپ میں بند کر دیا گیا تھا اور وہ
 سلاخوں کے پیچھے ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔ غصہ بے

سکونی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ رک کر ایک
 زوردار مکا سلاخوں پہ مارا۔ ہاتھ کی پشت سے جلد
 پھٹ گئی۔ مگر درد کے ہونا تھا؟ غصہ بے بسی ہر چیز پہ
 غالب تھی۔

تب ہی آہٹ ہوئی۔ اہلکار آئے۔ لاک اپ کھولا
 اور اسے باہر لے آئے۔ ایس ایچ او کے روشن سے
 آفس میں داخل ہوتے وہ ٹھٹکا تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں
 سکڑیں۔ سامنے آبدار بیٹھی تھی۔ چائے رکھی جا رہی
 تھی۔ سوڈ بوٹڈ ملازم ساتھ کھڑا تھا۔ آہٹ پہ آبی نے
 گردن موڑی۔

”مجھے احمر نے بھیجا ہے مگر مجھے دیر ہو گئی۔ یہ ایف۔
 آئی آر کاٹ چکے ہیں۔“ وہ نرمی سے کہنے بولی۔ کسی
 نے فارس کے سامنے بھی چائے کا کپ رکھا۔ وہ چبھتی
 نظروں سے آبی کو دیکھتا بیٹھ گیا۔ غصہ اب غائب ہو چکا
 تھا۔

”آپ آج بھی چائے نہیں پییں گے کیا؟“ آبی
 نے مسکرا کر سادگی سے کپ کی طرف اشارہ کیا۔

”میم! آپ کو دیر ہو رہی ہے۔“ باوردی ملازم نے
 دبے لفظوں سے یاد کروایا۔ آبدار نے گہری سانس
 بھری۔ اور ایس ایچ او کو دیکھا۔ ”کل بابا آپ کو خود فون
 کر لیں گے تب تک مجھے امید ہے کہ آپ ہمارے
 دوست کسی قسم کا تشدد نہیں کریں گے۔“

”بالکل“ آپ بے فکر رہیں۔“ اس نے فرض
 شناسی سے یقین دہانی کروائی۔ اب کے آبی نے چہرہ گھما
 کر افسوس سے فارس کو دیکھا۔ ”مجھے شرمندگی ہے کہ
 میں آپ کے کوئی کام نہیں آسکی۔ میری سری لنکا کی
 فلائٹ ہے مجھے ایر پورٹ پہنچنا ہے۔“

”ایس ایچ او صاحب! ہمیں پرائیویسی مل سکتی
 ہے؟“

آبدار ذرا چونکی پھر سر کے خم سے ایس ایچ او کو
 اشارہ کیا۔ چند ہی لمحوں میں وہ سب وہاں سے اٹھ کر
 چلے گئے۔ روشن کمرے کا دروازہ بند ہوا تو پیچھے خاموشی
 چھا گئی۔

”جی کہہ؟“ آبدار سکون سے اس کی طرف رخ

کے پوچھنے لگی۔

”آپ سری لنکا جا رہی ہیں؟“

آلی نے سر ہلایا۔

”نپوچھ سکتا ہوں کیوں؟“ اس کی نگاہیں آبدار کی آنکھوں پہ جمی تھیں۔

آبدار نے ایک لمحے کے توقف سے جواب دیا۔
”اپنی ریسرچ کے سلسلے میں۔“

”وہ جو آپ کلینکل ڈیٹہ سے گزرنے والے مریضوں پہ کرتی ہیں۔ اچھا ٹھیک۔“ وہ ٹیک لگا کر بیٹھا، انگلی ٹھوڑی تلے رکھے کچھ سوچا۔

”یعنی کہ آپ کسی مریض کا انٹرویو کرنے جا رہی ہیں۔“

آبدار نے اس دفعہ دو تین سیکنڈ کا توقف کیا۔
”جی! اس کی آنکھوں میں سایہ لہرایا تھا۔ وہ مضطرب نظر آنے لگی تھی۔“

”کیا وہ مریض سعدی یوسف ہے؟“ وہ اسی انداز میں بولا۔

آلی کے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑ گئے۔ ”سوری؟“
”آبدار بی بی!“ وہ آگے کو ہوا۔ اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ہلکا سا مسکرایا۔ ”مجھے معلوم ہے آپ کے والد اس کے اغوا اور روپوشی میں ملوث ہیں اور یہ بھی کہ وہ سری لنکا میں ہے۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ اپنے والد کے لیے کتنی حساس ہیں۔“

”مجھے نہیں معلوم آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ وہ ناراضی سے کہتی اٹھی۔

”واپس بیٹھو!“ وہ اتنے کٹ دار انداز میں بولا کہ آلی کے کان سرخ ہو گئے۔ وہ واپس بیٹھی۔

”مجھے اونچی آواز سے مت ڈرامیں میں کسی سے ڈرتی نہیں۔“ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر ہلکا سا غرائی۔
”میں آپ کو اچھی طرح سمجھ چکا ہوں۔ آپ خطرناک ہیں۔ نہ کہ سادہ اور معصوم۔ مگر آپ کا ضمیر زندہ ہے۔ آپ خود اچھی ہیں، مگر برا کرنے والوں کو روکتی نہیں ہیں۔ نیوٹرل رہتی ہیں۔“

”میں آپ کے کسی الزام کا جواب دینے کی پابند

نہیں ہوں۔“

”اس ملک میں آبدار بی بی! انصاف ہے نہ قانون۔ یہاں جج، جیوری اور جلاؤ، ہمیں خود بننا پڑتا ہے اور اگر آپ چاہتی ہیں کہ میری جلاویت آپ کی رہائش گاہ تک نہ پہنچے تو آپ کو ایک سائیڈ منتخب کرنی ہوگی۔“
ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔ ”ظالم کی یا مظلوم کی۔ بولے آپ کس کے ساتھ ہیں؟ اور میری باتوں کو ہلکا مت لیجیے گا۔ یہ ہتھکڑیاں۔۔۔“ کلاسیاں اٹھا کر دکھائیں۔ ”مجھے روک نہیں سکتیں۔“

”مجھے واقعی نہیں پتا آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“
”بی بی! کسی انسان کے سینے میں دو دل نہیں ہوتے۔ یا آپ مظلوم کے ساتھ ہیں یا ظالم کے۔ آپ کس کے ساتھ ہیں؟“

وہ دبے دبے غصے اور بے بسی سے اسے دیکھے گئی۔
بولی کچھ نہیں۔

”اگر وہ زندہ سلامت ہمارے خاندان کو واپس مل گیا تو میں آپ کے خاندان کو چھوڑ گا بھی نہیں، یہ میرا وعدہ ہے۔ آپ کو بدلے میں میرا صرف ایک کام کرنا ہوگا۔“ اس کی آنکھوں سے ایک لمحے کے لیے بھی نگاہ ہٹائے بغیر وہ آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ آلی کی آنکھوں کے کٹورے بھیگے مگر وہ چپ رہی۔ فارس نے ہاتھ بڑھا کر پین ہولڈر سے قلم نکالا، نوٹ پیڈ سے کاغذ پھاڑا، چند لمحے کے لیے سوچا، پھر اس نے چند حروف لکھے۔ HAMAN اور ان کو کانٹے کا نشان لگا کر کاٹا، پھر کاغذ کو چار تہ لگا کر اس کی طرف بڑھایا۔ ”یہ اس کو دے دیجیے گا۔“

آلی نے بیگی آنکھوں سے کاغذ کو دیکھا، مگر چھوڑا تک نہیں۔ ”یہ کیا ہے؟“

”یہ اس کی آزادی کا پروانہ۔ وہ سمجھ جائے گا۔“
آلی نے کاغذ کو نہیں چھوڑا۔ فارس آگے بڑھا، اس کا برس کھولا، اور کاغذ اندر ڈال دیا۔ وہ اسے روک بھی نہ سکی۔ عامل تنویم خود پٹاٹا تازہ ہو چکی تھی۔

فارس نے پیچھے ہو کر بیٹھے، کان کی لو مسلتے اسے دیکھا۔ ”فیصلہ آپ کا ہے۔“

”مجھے نہیں معلوم آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“
ناراضی، غصہ، بے بسی، ہر جذبہ اس کی بھیگی آنکھوں
میں ہلکورے لے رہا تھا۔ وہ پرس لیے اٹھی اور
دروازے تک گئی۔ پھر رکی۔ ”کنفیو شس نے کہا تھا“
انتقام کے سفر پہ نکلنے سے پہلے تمہیں چاہیے کہ دو
قبریں کھودو ایک اپنے دشمن کی اور دوسری اپنی!“
”تو پھر بے فکر رہیے کیونکہ میں اپنی قبر کھود کر ہی
اس سفر پہ نکلا تھا!“ آبی مڑ کر اسے دیکھ بھی نہ سکی بس
تیزی سے باہر نکل گئی۔



’اور کچھ دیر میں لٹ جائے گا ہر بام پہ چاند
عکس کھو جائیں گے، آئینے ترس جائیں گے
جس وقت زمرواپس گاڑی میں آکر بیٹھی تو فرنٹ
سیٹ پہ موجود اسامہ اور پیچھے بیٹھی حنین بے چینی سے
آگے ہوئے۔“ کچھ بتا چلا؟“

”ہاں۔ مقتول قمر الدین کچھ عرصہ فارس کے ساتھ
جیل میں رہا تھا۔ دس اگست کو اس کو اغوا کیا گیا اور
انیس اگست کو دو آدمی اس کی لاش اس کے گھر
پھینک گئے، پوسٹ مارٹم کے مطابق قتل 28 اور 29
اگست کی درمیانی رات ہوا تھا۔ ان دو آدمیوں میں سے
ایک شخص ناظم پکڑا گیا ہے، وہ بھی فارس کے ساتھ
جیل میں تھا، اس کی شہادت پہ پولیس نے فارس کو
گرفتار کیا ہے۔ ناظم کا کہنا ہے کہ آدمی کو گولی فارس
نے ماری تھی۔“

”ظاہر ہے وہ جھوٹ بول رہا ہے۔“ سیم فوراً بولا
زمر نے گہری سانس لی۔

”ہاں ظاہر ہے۔ خیر کل پولیس فارس کو عدالت
میں پیش کر کے جسمانی ریمانڈ لے گی۔“

”جسمانی ریمانڈ کیا ہوتا ہے؟“

”یعنی کہ پولیس کچھ دن کے لیے ملزم کو تھانے میں
رکھ کر اس سے گفتگو کرے گی۔“ زمر سیٹ بیلٹ
پہنتے ہوئے بتا رہی تھی۔ ”مؤثر کیس ہے، چودہ دن کا
ریمانڈ مل سکتا ہے۔ لیکن اکٹھا نہیں۔ تین، تین، پانچ

پانچ دن کر کے۔“

”یعنی اتنے دن وہ اس۔۔۔ اس اے ایس پی کی
تحویل میں ہوں گے؟“ حنین بے بسی سے بولی تھی۔

”نہیں، یہ کیس اس کے تھانے کا نہیں ہے۔ جو
ایس آئی اس کے ساتھ ہمارے گھر آیا تھا، یہ اس کا
کیس ہے، سرد شاہ صرف معاون تھا کیونکہ ناظم کو
سرد شاہ کے علاقے سے اسی کی مدد سے گرفتار کروایا گیا
ہے۔“

”یعنی اگر سرد شاہ نہ ہوتا تو یہ سب اتنا آسان نہ
ہوتا۔“ حنین نے کیا سوچ کر یہ کہا تھا، زمر جانتی تھی،
مگر اب اس بات پہ کیا تبصرہ کر لی۔

گھر میں ایک عجیب تنہائی کا احساس ہر کونے سے
ٹپک رہا تھا۔ ابا اور ندرت کو ان کی واپسی تک لا علم
رکھنے کا فیصلہ کر کے وہ تینوں زمر کے کمرے میں آ
گئے۔ دروازے بند کیے، سیم نے ایک ایک چٹخنی
اور لاک چڑھایا۔ خوف ان کے آس پاس سانس لے
رہا تھا۔

”میں اور حنہ بیڈ پہ سو جائیں گے، تم صوفے پہ
سو جاؤ۔“ زمر نے نرمی سے اسے پکارا جو آج ایک دم
بڑا بڑا اور سنجیدہ سا نظر آنے لگا تھا۔

”نہیں، میں اپنے کمرے سے میٹرس لے آیا ہوں،
نیچے ڈال لوں گا۔ یہ صوفہ بہت سخت ہے، اس کے
ساتھ کالافینج میں ہے نا، ایک دن میں لیٹا اس پہ تو دو دن
کمر دکھی تھی میری۔“ زمر نے بے اختیار اس خالی
صوفے کو دیکھا۔ دل کو زور سے کسی نے جیسے مٹھی میں
لیا تھا۔

رات قطرہ قطرہ پکھلتی رہی۔ تینوں کھلی آنکھوں
کے ساتھ چت لیٹے رہے۔ پھر حنہ بولی۔

”یہ قتل 28 اگست کی رات کو ہی کیوں ہوا؟“

”ہم دونوں کو پتا ہے یہ سب کسی نے جان بوجھ کر
اسی رات کروایا جب ہسپتال والا واقعہ ہوا۔ لیکن۔۔۔“
وہ الجھ گئی تھی۔ ”وہ یہ سب تب ہی کروا سکتے ہیں جب
ان کو آگ لگنے سے پہلے معلوم ہو چکا ہو کہ فارس یہ
کرے گا! دیکھو آگ کاسن کران کا شک فارس کی

طرف جانا تو بنتا ہے، مگر ان کو ”پہلے“ کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟ یہ صرف میرے اور فارس کے درمیان تھا، ہم نے کسی سے فون پہ بھی ڈسکس نہیں کیا۔“
سیم خاموش لیٹا، ان کی باتیں سنتا رہا۔
وہ اس سے کچھ نہیں چھپا رہی تھیں۔ گھر والوں سے باتیں چھپانے کے نتائج کبھی اچھے نہیں نکلتے۔
”ہو سکتا ہے“ ان کو پہلے معلوم نہ ہو، صرف اتفاق سے اسی رات۔“

”اتفاق سے اسی رات اسی شخص کا قتل ہوا جس کا فارس سے کوئی تعلق بھی تھا؟ میں اسے اتفاق نہیں مان سکتی۔“
”کیا کوئی شخص ماموں کا جعلی alibi نہیں بن سکتا؟ کورٹ میں کہہ دے کہ فارس غازی اس رات میرے ساتھ تھا؟“

”استغفر اللہ حنین! یہ جرم ہے، پر جری ہے، گناہ کبیرہ ہے!“ وہ خفا ہوئی تھی۔

”حنہ شرمندہ ہو گئی۔“ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔
ادھر قصر کاردار کی اسٹڈی کی کھڑکیوں پہ بارش کی ننھی بوندیں گر رہی تھیں۔ دھندلے شیشے کے پار دیکھو تو ہاشم کے سامنے ناخوش سا خاور کھڑا تھا۔

”سر! آپ کو گھر کی تلاشی سے روکنا نہیں چاہیے تھا، میری ساری محنت کو اس ایک چیز نے کمزور کر دیا ہے۔“

”وہ لڑکا میرا دروازہ توڑنے والا تھا۔ میں کیسے نہ کھولتا؟ ہم یہ سب کچھ خود پر سے شک ہٹانے کے لیے ہی کر رہے ہیں۔“

”یہ بھی ہے۔ بہر حال میں سب درست کر لوں گا۔ غازی اگلے کئی سال جیل سے باہر نہیں آئے گا۔“
اور ان سب سے دور، تھانے کے نیم اندھیرے کمرے میں تیز روشنی کا بلب جھول رہا تھا اور میز کے سامنے بیٹھا آئی او پوچھ رہا تھا۔ ”آغاز تعیش ہے“ میں آرام سے پوچھ رہا ہوں۔ تمہارا قمر الدین سے کس بات میں جیل میں جھگڑا ہوا تھا؟“

”آرٹیکل تیرہ کے تحت مجھے خاموش رہنے کا حق

ہے۔“ وہ ٹیک لگا کر بے نیاز سا بیٹھا تھا۔
”تم 28 اور 29 اگست کی درمیانی شب کہاں تھے؟“
آئی او نے بھی تحمل سے پوچھا۔
”آرٹیکل تیرہ کے تحت مجھے خاموش رہنے کا حق ہے۔“

اور وہ عجیب، وحشت زدہ سی رات اسی طرح قدم بہ قدم روشنی کی جانب بڑھتی رہی۔



کھلا یہ راز کہ آئینہ خانہ ہے دنیا اور اس میں مجھ کو تماشا بنا گیا اک شخص کو لبو ایک ساحلی شہر تھا۔ ہوا ہمہ وقت پُر نرم رہتی تھی۔ ساحل کے قریب چند ہوٹلوں کی بلند و بالا عمارتیں تھیں۔ ان میں نیلے شیشوں سے ڈھکا ایک اونچا اور عالیشان ہوٹل بھی تھا۔ اس کی ریسپشن پہ روخسایاں ٹورسٹ گگماتے، غرض ہر وہ عنصر بکھرا تھا جو کسی بھی ہوٹل کا خاصا ہوتا ہے۔ ایسے میں سرخ اسکارف والی خاموش سی آبدار کو فصیح ریسپشن سے دائیں جانب لے جا رہا تھا۔ وہ سوٹ میں ملبوس، دبلا پتلا، اونچا سا مرد تھا، سریالوں سے صاف، سیاہ چکنا سا۔ رنگت بھی بے حد سیاہ۔ جیسے کوئی حبشی ہو اور دانت اتنے ہی سفید۔

”آئیے۔“ وہ گراؤنڈ فلور پہ موجود کھلے سے کچن میں آئے جہاں قطاروں میں کاؤنٹرز بنے تھے اور سفید یونیفارم میں ملبوس باورچی کام کرتے نظر آ رہے تھے۔ فصیح آگے چلتا ہوا پیٹری میں آیا۔ دروازہ بند کیا۔ وہ دونوں اندر تنہا رہ گئے تو اس نے دیوار پہ لگے سوچ بورڈ کو ہاتھ سے دبا کر ایک طرف سلائیڈ کیا، نیچے ایک کی پیڈ تھا۔ اس نے چار نمبر پرپس کیے تو دیوار میں درزی ابھری اور پھر۔ دیوار ایک طرف سلائیڈ ہو گئی۔ آگے لفٹ کے بند دروازے تھے اور ساتھ ایک آلہ لگا تھا۔ فصیح نے بٹن دبایا، پھر اپنی تھوڑی آلے میں رکھی، روشنی کی لکیر نکلی، اس کی آنکھ کے retina کو تشخیص کیا، ہراسنل بجا اور دروازہ کھل گیا۔

”کتنے لوگ اس جگہ سے آگے جاسکتے ہیں؟“

لفٹ میں سوار ہوتے اس نے پوچھا تھا۔

”صرف تین لوگ۔ میں اس چکن کا ہیڈ شیف جو ہمارا اہم آدمی ہے اور ہاشم کاردار۔ ان کے علاوہ کوئی اس لفٹ کو نہیں کھول سکتا۔“

”کیا میری ماں کو بھی اسی بگہ رکھا تھا یا بانی؟“ وہ آہستہ سے بولی۔ فصیح احتراماً خاموش رہا۔

لفٹ ایک فلور نیچے گئی۔ دروازے کھلے۔ آگے راہداری تھی۔ اس کے اختتام پر ایک اور دروازہ تھا۔ اس کو کھولنے کے لیے تین لاکس تھے۔ پہلے فصیح نے کوڈ داخل کیا۔ آبدار نے کن اکھیوں سے دیکھا۔ نائن ٹو تھری سکس۔ پھر انگلیاں رکھیں، فنگر پرنٹ اوکے ہوا۔ تو اوپر لگے آلے میں ٹھوڑی رکھی تاکہ شعاع اس کی آنکھ کو شناخت کر لے۔ بالآخر دروازہ کھل گیا۔ اندر ایک لاؤنج سا بنا تھا۔ چند گارڈز ادھر موجود تھے اور ایک کونے میں بنے چکن میں فلیپینو میڈ کام کر رہی تھی۔

فصیح نے آبی کے قریب سرگوشی کی۔ ”یہ میری اینجیو ہے۔ اس کو ہم نے یہی بتایا ہے کہ یہ انڈیا میں ہے۔ لڑکے کو بھی یہی معلوم ہے۔“

آبی نے صرف ایک گلہ آمیز نظر اس پر ڈالی اور آگے آئی۔ سامنے ایک کمرے کے دروازے پر گارڈز پہرہ دے رہے تھے۔

”آپ دیکھ سکتی ہیں۔ وہ صرف ایک مہمان ہے۔“ پہلے میں سمجھی تھی کہ صرف وہ قیدی ہے، لیکن یہ گارڈز یہ ملازمہ یہ سب قیدی ہیں۔“ آبدار شاکی نظروں سے اسے دیکھ کر بولی تو وہ خاموش ہو گیا۔

میری آہٹ۔ باہر نکلی تو ان دونوں کو دیکھ کر چونکی۔ نگاہیں آبدار پر جا ٹھہریں۔

”مس آبدار!“ اسے حیرت ہوئی۔

”مس آبدار کو سعدی یوسف سے ملنا ہے۔“ آبی میری کو جواب دے کر سنجیدہ سی فصیح کے ساتھ دوسرے کمرے میں آگئی۔

”یہ ایک عام سا سائنس دان تم لوگوں کے لیے اتنا خاص کیوں ہے؟ تم اس جیسے دس سائنس دان خرید سکتے ہو۔“ بالا آخر وہ بول اٹھی۔

”میں نے بھی ہارون صاحب سے یہی کہا تھا۔ لیکن ہاشم نے انہیں شیشے میں اتارا ہوا ہے۔ لڑکے کے پاس ہاشم کے راز ہیں، ان کی حفاظت کے لیے وہ اسے یہاں مقید رکھنا چاہتا ہے، اسے مار نہیں سکتا، اور چاہتا ہے سارا خرچا بھی ہم کریں۔“ فصیح بھی ناخوش تھا۔ ”مگر جس دن ہارون صاحب کو لگا کہ یہ بالکل ناکارہ ہے، اس دن وہ اس سے جان چھڑالیں گے۔“

آبدار کا دل خراب ہونے لگا، مگر چہرے پر سپاٹ سا تاثر رکھے وہ مختصر بیٹھی رہی۔ وہ مسلسل اضطرابی انداز میں انگلیاں موڑ رہی تھی۔

آہٹ یہ بھی اس نے جنبش نہ کی، یہاں تک کہ وہ اس کے سامنے کرسی پر آ بیٹھا۔ اب کے آبدار نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ وہ چھوٹے گھونگھریالے بالوں والا دبلا پتلا نوجوان تھا جس کی رنگت سنولائی ہوئی تھی۔ بیٹھتے کے ساتھ ہی وہ بغور ادھر ادھر کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ (فرار ہونے کے لیے کسی روزن کی تلاش میں شاید۔) پھر آبدار کو دیکھا اور پھر اس کے عقب میں کھڑے فصیح کو۔

”سعدی یوسف! یہ آبدار عبید ہیں، ایک اینجیو تھراپسٹ۔ ہمیں ان کے ساتھ ایک سیشن کرنا ہے، یہ کاردار صاحب کا حکم ہے۔“

سعدی نے باری باری ان دونوں کو دیکھا، ابرو تن گئے۔ ”کاردار صاحب کو کہو کہ اپنے احکامات اپنے ملازموں تک۔“ ان دونوں کی طرف اشارہ کیا ”محدود رکھیں تو بہتر ہو گا۔“

”آرام سے!“ فصیح نے سختی سے ہاتھ اٹھا کر اسے گھورا۔ ”یہ ہارون عبید کی صاحبزادی ہیں، تم۔“

”تھینک یو فصیح! کیا تم ہمیں اکیلا چھوڑ سکتے ہو؟“ وہ گردن اٹھا کر فصیح کو حتمی نظر سے دیکھتے بولی تو وہ خاموش ہوا، پھر ہر نکل گیا اور دروازہ بند کر دیا۔ آبدار نے نگاہوں کا رخ اس کی طرف پھیرا، وہ تندی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”سو تم ہاشم کاردار کے مہمان ہو۔“ سپاٹ سا گویا ہوئی۔

”آپ کو کیا چاہیے مجھ سے؟“ وہاں بھی اتنا ہی شک و شبہ تھا۔

”مجھے نہیں۔ کرنل خاور کو تمہارے وکیل کا نام چاہیے۔ ڈور نمبرون تم مجھے وکیل کا نام بتا دو۔ ڈور نمبر نو۔ میں تمہیں (ہینا سس) کے ذریعے کمپو مائیز ڈپوزیشن میں لے آؤں جہاں تم کمزور پڑ کر اس کا نام لے دو گے۔ اب بتاؤ سعدی یوسف! پہل میں کروں یا تم کرو گے؟“

سعدی دھیرے سے مسکرایا اور آگے کو ہوا۔ ”ان جادو گروں نے کہا، اے موسیٰ پہلے آپ ڈالیں گے (عصا) یا پہلے ہم ڈالیں (اپنی رسیاں) سو ہاشم کا اگلا پتا ایک ہینٹسٹ کو میرے ساتھ لانا ہے؟“

اس نے مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”یا تو ہاشم نے آپ کو میرے بارے میں تمام معلومات نہیں دیں، یا آپ نے اس کو ہینٹسٹ کے بارے میں تمام معلومات نہیں دیں۔ کیونکہ آپ کسی کو اس کی مرضی کے برخلاف ہینٹسٹز صرف تب کر سکتی ہیں جب وہ کمزور اعصاب کا مالک ہو۔ میرے جیسا آدمی اتنی آسانی سے ہینٹسٹز نہیں ہوتا۔“

آبدار بس تاسف سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ ایک معصوم، نرم، مسکراتا لڑکا جو کیفے میں بیٹھا خود سے بڑی نیچر کو سمجھا رہا تھا، وہ کہیں کھو گیا تھا۔ یہ تلخ طنزیہ لہجے اور زخمی آنکھوں والا نوجوان کوئی اور تھا۔

”سعدی یوسف!“ اس نے گہری سانس لی۔ ”میں فرعون کے ساحلوں میں سے نہیں ہوں۔ کیونکہ ڈور نمبر تھری یہ ہے کہ تم ان دونوں راستوں سے انکار کر دو اور میں خاموشی سے واپس چلی جاؤں، کیونکہ نہ مجھے تمہیں ہینٹسٹز کرنے میں دلچسپی ہے، نہ وکیل کا نام جاننے میں۔ میں کلینکل ڈیٹھ ہے ریسرچ کر رہی ہوں سنا تھا تم بھی کلینکل ڈیٹھ شکار ہوئے تھے۔ خاور اور بابا سے میں نے یہی کہا ہے کہ مجھے تمہارا تجربہ سننے میں دلچسپی ہے، یہ بھی جھوٹ ہے۔“ ایک سانس میں بولتے ہوئے وہ رکی۔

سعدی نے آنکھیں سکیڑیں۔ ”کراسے دیکھا۔“ پھر کیوں آئی ہو تم؟“

”صرف یہ دیکھنے کہ بابا واقعی کسی انسان کو قید کر سکتے ہیں یا نہیں!“

”اوہ اچھا، تو تم انسانی ہمدردی کے تحت آئی ہو۔ یوں کرو، جا کر ہاشم سے کہو، ڈاکٹر مایا کے متبادل کے طور پر لڑکیوں کو بھیجنا چھوڑ دے۔“

”میں سمجھی نہیں؟“ اس نے واقعی نا سمجھی سے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

سعدی اسی طرح زخم خورہ سا مسکرایا۔ ”اگر تمہارے اندر اتنی انسانی ہمدردی ہوتی، تو نوٹسرواں کو اپنے منگیتر سے یوں بری طرح نہ پٹواتیں۔“

آبدار کے ابرو تعجب سے اکٹھے ہوئے۔ ”کیا؟“

”اور اس پر مستزاد، تم اسی کیفے میں بیٹھی تھیں جب تمہارا منگیتر اس کو پیٹ رہا تھا، ایسے ظاہر مت کرو جیسے تمہیں یاد نہیں۔ تم ہماری یونیورسٹی میں کچھ عرصے کے لیے آئی تھیں۔ میں ایک دفعہ کوئی چہرہ دیکھ لوں تو بھولتا نہیں ہوں۔!“ آنکھوں میں اس لڑکی کے لیے غصہ تھا۔

وہ بس اسے دیکھ کر رہ گئی۔ ”نہ میں تمہیں جانتی ہوں، نہ تم مجھے جانتے ہو، تو مجھ سے اتنے خفا کیوں ہو؟“

”تم ہارون عبید کی بیٹی ہو، ہارون عبید آئل کارٹیل کا اہم رکن ہے۔ تمہارا چہرہ دیکھ کر مجھے دو سیکنڈ میں ساری کہانی سمجھ میں آگئی ہے۔ ہاشم نے مجھے ہارون عبید کے ہاتھوں بیچ دیا ہے۔ ہاشم کا ردوار ”فرعون“ ہے جس کے پاس بہت طاقت ہے، اور تمہارا باپ جانتی ہو وہ کون ہے؟“

آبدار نے غم آنکھوں سے اسے دیکھا، بولی کچھ نہیں۔

”وہ فرعون کے زمانے میں تھا، جس کے پاس بے انتہا دولت تھی، جس کے خزانوں کی کنجیاں کئی اونٹ مل کر اٹھاتے تھے۔ اس کا نام تھا قارون، فرعون اور قارون، دونوں اللہ کے نافرمان تھے۔ دونوں ایک

سے گناہگار تھے۔ تم بھی ان کی سائیڈ پہ ہو۔“
 ”میں ان کے کسی کام میں شریک نہیں ہوں۔“
 اس کا گلا رندھا۔ ”تم مجھے نہیں جانتے۔ میرے
 بارے میں اتنے بڑے نتیجے قائم مت کرو۔ نہ میں
 تمہاری دشمن ہوں نہ ان کے ساتھ ہوں۔ میں غیر
 جانب دار ہوں!“
 سعدی تلخی سے مسکرایا۔

”Those who lived withouten
 infamy or praise!“

(رہتے تھے بدنامی اور نیک نامی کے بغیر)

آبدار کو دھچکا لگا۔ حیرت اور دکھ سے آنکھیں
 ساکت ہوئیں۔ ”تم میرا موازنہ دانتے کی جہنم کے
 جہنمیوں سے کر رہے ہو؟ تم کیسے کسی انسان کے
 بارے میں اتنے جج مینٹل ہو سکتے ہو!“

سعدی چند ثانیے ان ہی شک و شبہ کے سیاہ سرمئی
 بادلوں کے درمیان کھڑا اس کو دیکھتا رہا۔

”اگر تم واقعی ان کی آلہ کار نہیں ہو، جس میں مجھے
 شک ہے، اور اگر تم واقعی اتنی ہی غیر جانب دار ہو جتنا
 تم خود کو ظاہر کر رہی ہو، تو یاد رکھنا، وہ لوگ جو ظلم کے
 خلاف آواز نہیں اٹھاتے، اور خود کوئی غلط کام بھی نہیں
 کرتے، وہ جو غیر جانب دار ہوتے ہیں، اللہ ان کو ان کی
 نمازوں اور صدقات کے باوجود عذاب سے محفوظ
 نہیں رکھے گا۔ میں کوئی نیک آدمی نہیں ہوں، نہ مجھے
 خود پہ کوئی غرور ہے، مگر میں نے ظلم کے سامنے نیوٹرل
 رہنے کے بجائے ”سائیڈ“ منتخب کی ہے۔ میں جانب
 دار ہوں اور مجھے فخر ہے اپنی جانب داری پہ۔ سو میں
 تمہیں ایک نصیحت کرنا ہوں، یک لیڈی۔“ آگے کو
 جھک کر، اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے، چبا چبا کر
 بولا۔ ”غیر جانب دار رہنے والوں کو فلاح اور بقا کی
 ساری امید ترک کر دینی چاہیے۔ کیونکہ جب عذاب
 آئے گا تو وہ صرف ان لوگوں پہ تمہیں آئے گا جو برے
 کام کرتے تھے۔ اللہ نے نہیں بنائے کسی انسان کے
 سینے میں دو دل۔ اگر آپ کا دل اچھے لوگوں کے ساتھ
 نہیں ہے تو وہ برے لوگوں کے ساتھ ہے۔“

کرسی جارحیت سے دھکیل کر اٹھا۔
 ”ڈور نمبر تھری“ میں انکار کرتا ہوں، تم چلی جاؤ۔
 اللہ حافظ۔“ اور کندھے جھٹکتا باہر نکل گیا۔
 آبدار گود میں ہاتھ رکھے، اسی طرح ڈوبتے دل کے
 ساتھ بیٹھی رہی۔ پرس میں مڑا مڑا سا کاغذ بھی ویسا ہی
 رکھا تھا اور اس لڑکے کا انداز اس کاغذ کے لکھنے والے
 جیسا ہی تھا۔ اس کو جب پہلی دفعہ دیکھا تھا تو وہ کسی کو
 امید دلا رہا تھا، آج جب دیکھا تو وہ امید توڑ رہا تھا۔ یہ وہ
 نہیں تھا جس کو اس نے کینے میں دیکھا تھا! وہ کہاں کھو
 گیا تھا؟



ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا، نہ وہ دنیا
 یہاں مرنے کی پابندی، وہاں جینے کی پابندی
 صبح کی چمکیلی کرنیں چھن چھن کر زمر کے کمرے
 میں گر رہی تھیں۔ سیم کامیٹرس ہٹ چکا تھا، زمر آئینے
 کے سامنے کھڑی تیار ہو رہی تھی۔ گھونگھریالے بال
 جوڑے میں بندھے تھے، اور سفید لمبی قمیص کے اوپر وہ
 بلیک منی کوٹ پہنے ہوئی تھی۔ تب ہی حنہ نے اندر
 جھانکا۔

”آج کیا ہو گا کورٹ میں؟“

”فارس کو مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا جائے گا،
 پھر پولیس اس کا ریمانڈ لے گی اور اس کو واپس تھانے
 لے جا کر حوالات میں بند کر دیں گے۔“ اپنا بیگ اور
 فائلز اٹھا کر وہ گھومی تو چوکھٹ میں کھڑی حنہ نے
 ستائشی نظروں سے اسے دیکھا۔

”یہ بلیک کوٹ، یہ کیس فائلز، یہ کورٹ روم ٹرائلرز!“
 ٹھنڈی سانس لی۔ ”یہ ہمیشہ میری فینٹسی رہے
 ہیں۔ لی اے کلینر کرنے کے بعد میں نے سوچا تھا کہ
 آگے نہیں پڑھوں گی، لیکن اب میرا دل کر رہا ہے کہ
 میں بھی لاء کروں۔“

زمر جواب دیے بنا اپنی چیزیں اٹھائے باہر آئی۔
 حنین ساتھ سیڑھیاں اترتے کہہ رہی تھی۔
 ”میں اور سیم بھی آپ کے ساتھ جائیں گے،“

دیکھیں انکار مت کجھے گا۔“ وہ سفید اور سیاہ جوڑے میں ملبوس، بال سلیقے سے فریج چوٹی میں گوندھے، کندھے پہ لمبی اسٹریپ کا پرس لیے تیار تھی۔ تیار تو سیم بھی تھا۔ کالر کف والی ڈریس شرٹ اور نہا کر گیلے بال سلیقے سے پیچھے کو جمائے وہ صوفے پہ بیٹھا جوتے کے تسمے باندھ رہا تھا۔

زمر نے گہری سانس لی۔

”تم دونوں کہیں نہیں جا رہے۔ فارس کو برا لگے گا۔“

”میں جیل بھی گئی تھی ایک بار، جب وہ ہتھکڑیوں میں ہوں تو زیادہ احتجاج نہیں کرتے۔ خیر آپ نہ لے کر جائیں ہم ٹیکسی لے لیں گے۔“

”جیسے تمہاری مرضی۔“ زمر نے شانے اچکا دیے۔ وہ دونوں پر جوش سے اس کے ساتھ باہر نکلے تھے۔

سیشن کورٹ کے احاطے کے باہر جب زمر نے گاڑی روکی تو حنہ نے ستائشی نظروں سے اس قدم طرز کی عمارت کو دیکھا۔

”مجھے بھی وکیل بننا ہے، زمر!“ اور ایک عزم لیے باہر نکلی۔ زمر آہنی گیٹ تک اسی خاموشی سے آئی، پھر رکی، حنہ کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔

”میرا ہاتھ پکڑ لو!“

حنین کی آنکھوں میں خفگی اُتری، اسے بہت برا لگا تھا۔ ”اللہ۔ زمر! میں کوئی بچی ٹھوڑی ہوں۔“

زمر کچھ کہتے کہتے رکی، پھر سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔ دونوں اس کے دائیں بائیں چلتے ہوئے ساتھ آئے۔ گیٹ کے اندر سیم مردوں والے حصے سے گزر گیا۔ وہ خواتین کی تلاشی والے کمرے سے گزریں۔ سامنے پچھری کے وسیع میدان نظر آ رہے تھے۔ کہیں سبزہ، کہیں عمارت۔ حنین نے قدم بڑھایا تو دل جوش سے بھر گیا۔ پہلی دفعہ کورٹ جا رہی تھی۔ ”واؤ۔“ ماموں کی گرفتاری اور متوقع ڈانٹ کا احساس بھی۔

چند ہی قدم کا راستہ طے کر کے حنین کو احساس ہوا کہ بہت لوگ تھے۔ اکثریت براق چمکتی سفید

شرٹ اور سیاہ ٹائی و سیاہ کوٹ والے تیز تیز چلتے وکلاء کی تھی۔ لوگ آ جا رہے تھے، تیز تیز۔ ہر قدم کے ساتھ رش بڑھتا جا رہا تھا۔ عورتیں کم تھیں، تھیں تو وہی سیاہ کوٹ، سفید دوپٹے والی، جو بڑے مزے سے کہیں بیٹھی تھیں یا چل رہی تھیں۔ مردوں کی طرح اونچے قمقمے لگا رہی تھیں۔ وہ تینوں قدم قدم آگے بڑھتے رہے۔ درمیان میں کتنے پلاٹ سے بنے تھے جہاں میزیں ہی میزیں تھیں، ہر ایک پہ کسی وکیل کا نام لکھا تھا، وہ وکلاء کے اوپن ایئر آفس تھے۔ صرف ایک میز؟ اور ان پہ جگہ جگہ لوگ بیٹھے تھے۔ لوگ ہی لوگ۔ حنہ کا دل ایک دم ٹھنکن کا شکار ہونے لگا۔ مگر وہ چلتی رہی۔

وہاں لوگ اتنی تیزی سے چلتے آ رہے تھے گویا سامنے والے سے ٹکرانے کا ارادہ ہو اور اتنا شور کہ الامان۔ کانوں میں بھانت بھانت کی آوازیں بڑ رہی تھیں۔ مختلف زبانیں۔ بولیاں دردناک۔۔۔ خفیلے لہجے تلفظ۔۔۔ درد کی باتیں۔

”جی مگر میں چاہتا ہوں کہ آپ ہی پلیڈ کریں اور۔۔۔“ ساتھ سے گزرتے وکیل کی رفتار کا ساتھ دینے کی کوشش کرتا ایک شخص کہہ رہا تھا۔

”استغاثہ کے دونوں گواہوں کو ڈس کریڈٹ کرنے۔۔۔“ کوئی اور قریب میں بولا تھا۔ وہ لاشعوری طور پہ زمر کے قریب ہو گئی جو اطمینان اور سنجیدگی سے چل رہی تھی۔ چند زینے عبور کیے اور وہ عمارت کے اندر داخل ہوئے۔

وہاں بھی مردوں کا وہی سمندر تھا۔ لوگ چڑھے ہی چلے آ رہے تھے۔ حنین زمر کے مزید قریب ہو گئی۔ اب وہ آگے پیچھے کے بجائے صرف سامنے دیکھ رہی تھی۔ شور ہی شور اور طویل راہداریاں بجن کے اختتام پہ ایک اور راہداری شروع ہو جاتی۔ کونوں میں وکلاء کی میزیں تھیں۔ جیسے جس کو جہاں جگہ ملی، بیٹھ گیا ہو۔ اتنی صبح بھی اتنا رش۔ اس نے ایک ساتھ اتنے مرد۔۔۔ وہ بھی اتنی تیزی سے چلتے، پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ حنین کا دل گھبرانے لگا، عجیب سی وحشت، خوف

سالے گھیرنے لگا۔

تھا۔

”میں بالکل، بالکل، بالکل بھی وکیل نہیں بننا چاہتی۔“ اور خفگی سے اندر بیٹھ کر دروازے لاک کر دیے۔ سیم کو بھی اندر بٹھالیا۔ وہ ناخوش تھا مگر اسے اپنی بہن کا خیال رکھنے کے لیے وہاں بیٹھنا تھا کیونکہ وہ گھر کا بڑا مرد تھا۔

زمر بار بار گھڑی دیکھتے جب واپس آئی تو مجسٹریٹ کے کمرے کے باہر اسے احمر کھڑا نظر آیا تھا۔ اس نے بھی زمر کو دیکھ لیا۔ سوتیزی سے قریب آیا۔

”مسز زمر۔“ وہ فکر مند لگ رہا تھا۔ ”میں نے بہت کوشش کی مگر آئی ایم سوری۔ میں پرچہ کٹنے سے نہیں روک سکا۔ ہوا کیا ہے؟“

”اس کو پھر سے فریم کیا گیا ہے۔ مرڈر کیس ہے اور اس کے پاس alibi بھی نہیں ہے۔“

”اوہ ہو۔“ وہ ادھر ادھر متلاشی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ زمر کو معلوم تھا کہ اسے کس کا انتظار ہے۔

”احمر! آپ کے یہاں رکنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔“

”وہ میرا دوست ہے۔“

زمر نے گہری سانس لی۔ ”فی الحال وہ ایسا نہیں سمجھتا۔“ احمر نے ابو نجیب سے بھیجے۔ وہ جواباً جتنے مختصر الفاظ استعمال کر سکتی تھی، کر کے ساری کتھانا ڈالی۔ احمر کی فکر مندی پریشانی میں بدلی۔

”جی“ میں نے یہی کہا تھا ہو مل والوں سے کہ میں جسٹس ڈپارٹمنٹ سے ہوں اور کیا کہتا؟ اس روز وہ ہارون صاحب کی رہائش گاہ پہ آیا تھا تو اس نے مجھ سے سوال جواب کیے تھے، میں نے محتاط جواب دیے، جھوٹ نہیں بولا۔“

”اور ہاں، آپ نے مجھے ٹیکسٹ بھیجا تھا کہ آپ کو کال کروں؟ وہ ٹیکسٹ میں نے صبح دیکھا، کیونکہ وہ مجھ سے پہلے فارس کھول چکا تھا۔“ اور اس کا لہجہ یہ چاہتے ہوئے بھی ملامتی ہو گیا۔ ”ایسی کیا خاص بات تھی؟“

احمر ایک دم شرمندہ ہو گیا ”وہ تو۔۔۔ کچھ بھی نہیں تھا“ ذرا ٹھہر کر بتانے لگا۔ ”میں شادی کر رہا ہوں فاطمہ

یکدم ایک راہداری کا موڑ مڑا تو اگلی راہداری جو برآمدے کی طرح تھی (یعنی ایک طرف عمارت اور دوسری طرف لان تھا) وہاں سے دو پولیس اہلکار، زنجیروں میں مقید دو قیدیوں کو لا رہے تھے۔ آف واٹ، میلے میلے کرتوں، جھاڑ جھنکار جیسی داڑھیوں، اور پیلے دانتوں سے ہنستے قیدی، جن کے ہاتھ پیر زنجیروں میں تھے۔ وہ ایک دم سے سامنے آئے تھے، ان کے چہرے۔۔۔ اف۔۔۔ حنہ خوف سے جم گئی، مگر زمر نے کہنی سے کھینچ کر اسے سائیڈ پر کیا۔ وہ دونوں ہنستے ہوئے انہیں دیکھتے آگے بڑھ گئے۔ حنین کے پاؤں کانپنے لگے۔ وہ بمشکل دو قدم مزید چل پائی۔

”مجھے گھر جانا ہے، واپس“ وہ ہمت ہار چکی تھی۔ زمر نے تاسف سے اسے دیکھا۔

”میں نے کہا تھا، تم لوگوں کو نہیں آنا چاہیے۔“

”میں تو ٹھیک ہوں۔“ سیم واقعی ٹھیک نظر آ رہا تھا مگر وہ رو دینے کے قریب تھی۔

”آپ مجھے واپس چھوڑ کر آئیں۔ ابھی اسی وقت“

اس نے نم آنکھوں سے زمر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ گہری سانس لے کر واپس مڑ گئی۔

واپسی پہ کورٹ رومز کے کھلے دروازے ان کے بائیں ہاتھ تھے۔ حنہ نے وحشت اور خوف کے احساس کے باوجود گاہے بگاہے اندر بھی جھانکا۔ ایک

سودس دفعہ لعنت ہوا امریکی ڈراموں پہ۔ وہ کورٹ رومز بالکل بھی امریکی ڈراموں جیسے نہ تھے۔ ہاں بھارتی فلموں سے تھوڑی بہت مشابہت رکھتے تھے، مگر بھارتی

فلموں والے کورٹ رومز گندے، میلے اور لوگوں سے کھچا کھچ بھرے ہوتے تھے۔ یہ صاف ستھرے تھے۔

لکڑی کا کام بھی سنہرا چمک دار تھا۔ مگر ڈراموں، فلموں کے برعکس ان میں وہ کرسیوں کی لمبی لمبی دو قطاریں نہیں تھیں۔ بلکہ کرسیاں تو صرف دو تین پڑی تھیں۔

باقی اوپر جج کا بیچ اور دونوں طرف کثرت سے بنے تھے شور ہی شور۔ وہ ڈراموں والی پر تقدس خاموشی ناپید تھی۔ گاڑی میں واپس بیٹھتے ہوئے اس نے زمر سے کہا

سے، کہیں ٹیم میں میرے ساتھ کام کرتی ہے، میں اسے منگتی پر کیا تحفہ دوں، یہی پوچھنا چاہتا تھا، پلیز برامت مانھیے گا، نہ میں آپ کا کوئی کوئی ہوں نہ دوست، مگر آپ سے زیادہ میرے حلقہ احباب میں کوئی sophisticated (نفس طبع) نہیں ہے۔ صرف اس لیے۔۔۔ میں غازی کو وضاحت دے دوں گا۔

زمر بس اس کو دیکھ کر رہ گئی۔ ”خیر، مبارک ہو آپ کو۔ مگر اس وقت، آپ کو دیکھ کر وہ کچھ الٹا سیدھا بول دے گا۔ آپ ابھی چلے جائیں، جب وہ ٹھنڈا ہو جائے گا تو میں آپ کی ملاقات کروا دوں گی۔“ اور وہ متاثر، متذبذب سالوٹ کیا۔

زمر کافی دیر اس راہداری میں کھڑی رہی۔ لوگ اسی طرح آ جا رہے تھے۔ وہ ویران، اداس نظروں سے سب دیکھتی رہی۔ ذہن بار بار اس کینڈل لائٹ ڈنر میں کی گئی اس کی سلگتی باتوں پہ بھٹک جاتا، مگر نہیں، ابھی یہ سب نہیں سوچنا تھا۔

دفعتا، وہ سیدھی ہوئی۔ پولیس الیکار اسے لارہے تھے۔ وہ رات والی جینز اور گرے شرٹ میں ملبوس تھا۔ ایک رات میں ہی شیو بڑھی ہوئی لگ رہی تھی۔ زمر کو دیکھ کر اس کی سنہری آنکھیں سکڑیں، ان میں چھین اتری، مگر منہ میں کچھ چاتا آگے بڑھتا رہا۔ وہ ہلکا سا مسکرائی، مگر اگلے ہی پل مسکراہٹ غائب ہوئی۔ فارس کے قریب، سیاہ کوٹ اور ٹائی میں ملبوس، خلجی صاحب چلتے آ رہے تھے۔

”ڈونٹ یو ڈیر!“ زمر کے سر پہ لگی، تلووں پہ بجھی۔ وہ قریب آئے تو وہ بظاہر مسکرا کر خلجی صاحب کی طرف گھومی۔

”آپ یہاں، خیریت ہے خلجی صاحب؟“

”یہ میرے وکیل ہیں۔“ وہ چبھتی آنکھیں زمر پہ جمائے بولا۔ زمر نے سلگتی نظروں سے اسے دیکھا مگر ہنوز مسکراتے ہوئے بولی۔

”آخری اطلاعات تک تمہاری وکیل میں تھی۔“ خلجی صاحب فون پہ بات کر رہے تھے، سر کے اشارے سے اسے سلام کیا۔ فارس چند قدم چل کر

اس کے بالکل مقابل آکھڑا ہوا، جتنی اجازت اس کی زنجیر اس کو دیتی تھی اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”زمر بی بی۔۔۔! مجھے آپ سے کسی اچھائی کی امید نہیں ہے۔“ دبی سرگوشی میں بولا۔ وہ اس سے لمبا تھا، زمر کو سراٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھنا پڑ رہا تھا۔

”ان سے ہے؟“

”وہ میرے ساتھ وفادار ہیں۔“ چبا چبا کر الفاظ ادا کیے۔

”اچھا!“ زمر دانت بہ دانت جما کر مسکرائی، پھر سر کو خم دیا اور وہاں سے ہٹ گئی۔ خلجی صاحب فون بند کر چکے تھے، اب اس سے حال احوال دریافت کرنے لگے۔ وہ جواب دیتی چند قدم آگے چلی آئی۔ پھر مزید چند قدم یہاں تک کہ وہ دونوں فارس کی حد سماعت سے دور ہو گئے۔ وہ تیکھی نظروں سے ان دونوں کو بات کرتے دیکھنے لگا۔

چند منٹ بعد وہ واپس اس کی طرف آئے۔ خلجی صاحب نے خوشگوار انداز میں زمر کو دیکھتے ہوئے فارس کو مخاطب کیا۔

”تم فکر نہ کرنا، زمر اچھے سے سب ہینڈل کر لیں گی۔ میں پھر اپنے آفس کی طرف جاتا ہوں۔“ فارس کا شانہ تھکا اور زمر کو گرم جوشی سے الوداع کہہ کر وہ آگے چلتے گئے۔

زمر نے مسکرا کر فارس کو دیکھا۔ ”وفادار، ہاں؟“

”کیا کہا ہے آپ نے ان سے؟“ وہ خشک انداز میں بولا تھا، ”بلکہ کس بات سے بلیک میل کیا ہے ان کو؟ ایک یہی کام تو آتا ہے آپ کو۔“

”جب تم چار سال جیل میں لوگوں سے لڑ جھگڑ کر اپنے لیے دشمن بنا رہے تھے نا، تو میں ایک سیاسی عہدے پہ کام کر رہی تھی۔ یہاں لوگ میری بات ٹالا نہیں کرتے۔“ وہ بھی اتنی ہی تنخی سے بولی تھی۔

”ہاں، میں نے تم سے چند جھوٹ بولے تھے۔ احمر کو بھی میں نے ہار کیا تھا لیکن تمہارے خلاف نہیں۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا جو تم سمجھ رہے ہو۔ دیکھو، ابھی وقت کم ہے، تمہارا نام ابھی پکارا جائے گا۔ اس وقت کو

”میں تمہیں آج بھی پہلے کی طرح گالف میں ہرا سکتا ہوں۔“ ہارون عبید مسکرا کر اس کی طرف چہرہ کر کے بولے۔

”برسوں پہلے میں ایک بے وقوف لڑکی تھی، جو تمہاری باتوں میں آکر تمہارے ساتھ زندگی گزارنے کے خواب دیکھنے لگی تھی۔“ وہ بھی تپانے والی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ہارون ٹھہر گئے۔ اس کو قدرے افسوس سے دیکھا۔

”یہ رشتہ ختم کرنے میں تم نے پہل کی تھی۔“ اتنے دن بعد تم نے یہ ذکر چھیڑ ہی دیا ہے تو اپنی تصحیح کر لو ہارون۔“ وہ سینے پہ بازو لپیٹتے اس کے سامنے آئی اور سرد مسکراہٹ کے ساتھ اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”ہمارے درمیان کبھی کوئی رشتہ نہیں تھا، تم اور میں اچھے دوست تھے، بلکہ دوستوں سے برتر کرتے تھے، پھر ہم نے شادی کا فیصلہ کیا تھا، اور ہمارے خاندان کو اس پہ اعتراض نہیں تھا۔“

”اور پھر تم نے مجھے ٹھکرا کر اورنگ زیب سے شادی کی تھی۔“

”یہ وہ چوائس تھی جس پہ میں پچھلے اڑتیس سال سے پچھتا رہی ہوں۔ ہارون! لیکن یہ مت بھولنا کبھی کہ میں نے تمہیں اس لیے ٹھکرایا تھا کیونکہ تم اپنی ایرانی کزن کے ساتھ انوالوڈ تھے۔ اور تم جانتے ہو کہ میں تمہاری بے وفائی سے واقف ہو گئی تھی، پھر بھی تم کتنے دھڑلے سے میری آنکھوں میں دیکھ کر مجھ سے شکوہ کر لیتے ہو کہ میں نے تمہیں ٹھکرایا تھا۔“ ملکہ کی اٹھی گردن اور مسکراہٹ ہنوز برقرار تھی۔ ہارون نے گہری سانس لی۔

”تمہیں اتنی پرانی باتیں یاد ہیں اورنگ زیب کی موت کے بعد ان دو سالوں میں۔“

”ایک سال دس ماہ میں۔“ اس نے میکائلی انداز میں تصحیح کی مگر وہ بولتے رہے۔ ”کتنی دفعہ میں نے چاہا کہ ہم کم از کم دوستی کے رشتے میں پھر سے منسلک ہو جائیں لیکن تم ہر دفعہ پرانی باتوں کو کیوں درمیان میں لے آتی ہو۔“

لڑنے میں ضائع مت کرو۔ ویسے بھی زیادہ سے زیادہ تین ہفتے بعد ٹرائل شروع ہو جائے گا، تم ان تین ہفتوں میں جتنے وکیل ڈھونڈ سکتے ہو ڈھونڈ لو، میں کسی ایک کو بھی تمہاری طرف نہیں رہنے دوں گی، اس لیے ان تین ہفتوں کے لیے مجھے اپنا وکیل رہنے دو۔ جس دن ٹرائل شروع ہو، اس دن تم فیصلہ کر لینا۔ مجھے فائر کر دینا میں چلی جاؤں گی، لیکن اس سے پہلے نہیں۔ اوکے!“

غصے اور سمجھانے کے ملے جلے انداز میں وہ بول بول کر چپ ہوئی تو وہ بھی چند لمحے سوچتا رہا۔

”آپ کو اگر میرا وکیل رہنا ہے تو ایک کام کریں۔“

زمر گہری سانس بھر کر رہ گئی۔ ”کہو!“

”سبز ملک۔۔۔ وہ لڑکی۔۔۔ اے ایس پی کی کزن اور سالی۔۔۔ وہ دو دن پہلے کوما سے نکل آئی ہے سو آپ نے اس امر کو یقینی بنانا ہے کہ وہ نیاز بیگ کو جیل سے نکلنے نہ دے۔ کیسے؟ یہ میرا درد سر نہیں ہے!“ حکم صادر کر کے وہ پلٹ گیا۔

زمر اسے دیکھ کر برہ گئی۔ راہداری میں بھانت بھانت کی بولیاں ہنوز گونج رہی تھیں۔



جسے گئے ہوئے خود سے ایک زمانہ ہوا وہ اب بھی تم میں بھٹکتا ہے اب بھی آجاؤ گالف کلب کے سبزہ زاروں پہ زمردی قالین سا چڑھا لگتا تھا۔ فضا میں آتے سرا کی مہک بھی گھاس بھی گویا لمبی لسی۔ یہ نرم گرم دھوپ سینک رہی تھی۔ وہ دونوں گھاس پہ آگے چلتے جا رہے تھے۔ ہارون نے نی شرت کے اوپر پی کیپ اوڑھ رکھی تھی اور جواہرات نے گھٹنوں تک آتا سادہ کرتا پہن رکھا تھا اور بال جوڑے میں بندھے تھے اتنے عام سے حلیے میں بھی وہ نازک اور خوب صورت لگ رہی تھی۔ پچھلے ماہ اس نے آنکھوں کی کاسمیٹک سرجری (آئی لڈ لفٹ) کروائی تھی جس سے اس کی آنکھیں زیادہ بڑی اور گہری لگنے لگی تھیں۔

”ہارون!“ وہ ایک قدم آگے ہوئی اور شیرنی جیسی آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈالیں۔

”تم میرے صرف دوست نہیں بننا چاہتے۔ میں جانتی ہوں۔ تمہارے پاس ہم سے زیادہ دولت ہے لیکن ہمارے پاس تم سے زیادہ طاقت ہے، ہم دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے، اس لیے ہم ساتھ کام کر رہے ہیں، لیکن میرا اعتماد تم کئی برس پہلے کھو چکے تھے۔ اگر تمہیں دوبارہ سے مجھ سے کوئی تعلق استوار کرنا ہے تو اس کے لیے تمہیں میرا اعتماد چاہیے اور اعتماد میں بھک میں بھی نہیں دیتی۔ اسے تمہیں لگانا ہو گا۔“ اور پھر دلکشی سے مسکرائی۔ ”سو محنت کرو ہارون! شاید کہ تم کھویا ہوا اعتماد کمالو۔“

پھر سر کے خم سے اشارہ کیا۔ ملازم فوراً ”تابع داری سے کٹ لیے آگے آئے۔ ہارون صرف مسکرائے اور کھیل کی طرف متوجہ ہوئے۔ دور دور تک پھیلے سبزے کا ہر تنکاد لچپی سے یہ کھیل دیکھنے کا منتظر تھا۔



وہ دل کہ اب ہے لو تھوکنہ ہنر جس کا وہ کم سے کم ابھی زندہ ہے، اب بھی آجاؤ ایکسی تک واپس جاتے ہوئے زمران دونوں کو بتا رہی تھی۔

”پانچ دن کا جسمانی ریمانڈ مل گیا ہے پولیس کو۔ چودہ دن تک وہ اس میں توسیع کرواتے رہیں گے، پھر فارس کو جوڈیشل کر دیا جائے گا یعنی کہ۔۔۔“

ان کے اگلے سوال سے پہلے اس نے وضاحت۔ ”اس کو جیل بھیج دیا جائے گا اور باقاعدہ مقدمہ شروع ہو گا۔ پہلے پراسیکیوٹر اپنے دلائل دے گا، پھر ہم دیں گے، پھر پراسیکیوٹر اپنے گواہ پیش کرے گا، پھر ہم کریں گے۔ اس کارروائی میں عرصہ لگ جاتا ہے، لیکن سب سے اچھی بات یہ ہے کہ جج مقدمے کے دوران کسی بھی دن کسی بھی وجہ سے ملزم کو بری کر سکتا ہے۔ بے گناہ ثابت کرنا گناہگار ثابت کرنے سے زیادہ آسان ہوتا ہے۔“

دونوں جواب میں کچھ نہ بولے۔

مگر گھر کے دروازے پہ پہنچ کر حنہ کے منہ سے ”اوہ“ نکلا اور زمر کا ایک دم دل بیٹھ گیا۔ ندرت کی گاڑی جس میں صداقت ان کو ڈرائیو کر کے گاؤں لے گیا تھا، وہ وہاں کھڑی تھی۔ ایک دریا کے پار اترنے پر ایک اور دریا کا سامنا! زمر نے لاؤنج کا دروازہ کھولا تو سامنے بڑے ایسا فکر مند بیٹھے تھے، اور ندرت پریشان سی نظر آرہی تھیں۔ زمر نے فون بند کر رکھا تھا اور حنہ اپنا فون گھر چھوڑ گئی تھی۔ یقیناً ”انہوں نے کئی کالز کی ہوں گی۔“

”زمر!“ ندرت گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر پریشانی سے اٹھیں۔ ”فارس کو کیوں لے کر گئی ہے پولیس؟ جیسے ہی جواہرات نے بتایا، ہم فوراً آگئے۔“

”یا اللہ، یہ مسز جواہرات بھی نا!“ حنین غصے سے بریڈ پٹائی آگے آئی اور ندرت کو شانوں سے تھام کر واپس بٹھایا۔

”زمر! بتاؤ کیا ہو رہا ہے یہ سب؟“ ایسا بھی بے چین تھے۔ وہ تھکی تھکی سی سامنے بیٹھی اور تفصیل، تسلی اور امید کے ساتھ بتانے لگی۔ ندرت بے ساختہ رونے لگی تھیں۔

”اس ملک میں کوئی قانون، کوئی دستور نہیں ہے کیا؟ جب دیکھو میرے بھائی کو مقدمات میں پھنساتے رہتے ہیں۔ اللہ غارت کرے ان کو۔“

”آمین!“ حنہ بریڈ پٹائی تھیں۔ اس آمین کہنے میں بھی دل ٹوٹ کر سوبار جڑا تھا۔

ندرت کو حنہ اوپر کمرے میں لے گئی۔ باقی سب بھی بکھر چکے اور وہ دونوں اکیلے رہ گئے، تو ابانے آہستہ سے اس سے پوچھا تھا۔

”کیا وہ باہر آجائے گا؟“

”مجھے واقعی نہیں پتا اب!“ وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ ابا غمگین سے بیٹھے اس کے لمبے پہ غور کرتے رہ گئے۔



دلیلوں سے دوا کا کام لینا سخت مشکل ہے

مگر اس غم کی خاطر یہ ہنر بھی سیکھنا ہو گا
کو لبو کی غم فضاؤں میں لپٹے ہوٹل کی بیس منٹ
میں اٹھا پتہ جاری تھی۔ پریدار سعدی کے کمرے کی
دیوار پہ ایل سی ڈی ٹی وی لگا رہے تھے۔ ڈی وی ڈیز کا
ایک چھوٹا کارٹن، پھل، چاکلیٹس، خشک میوے،
جوس کے ڈبے، نئے کپڑے، تازہ ریلیز ہوئے ہسٹ
سیلرز۔ سعدی عدم دلچسپی سے ان چیزوں کو دیکھ رہا تھا جو
وہ لوگ لالا کر اس کے کمرے میں رکھ رہے تھے۔ وہ
سیاہ جبشی صورت فصیح ان کی نگرانی کر رہا تھا۔
”ان احسانات کی وجہ؟“ اس نے سنجیدگی سے
جبشی صورت کو مخاطب کیا۔ اس نے ایک اچھتی نگاہ
سعدی پہ ڈالی۔
”یہ ہارون عبید کی طرف سے ہے، وہ سب جو تم نے
مانگا تھا۔“

”جس سے مانگا تھا، وہی دیتا تو اچھا تھا۔“ وہ بے زار
ساتھ کر لاؤنج نما کمرے میں آگیا۔ کسی نے اسے
نہیں روکا۔ وہ اس کمپاؤنڈ میں کھلا پھر سکتا تھا، اجازت
مل گئی تھی۔ وہ ابھی وہاں بیٹھا ہی تھا کہ یکدم فصیح اس
کے کمرے سے باہر نکلا اور کلنگ فلم میں لپٹی چیزیں میز
پہ پنچیں۔ سعدی منجمد ہو گیا۔ اندر اس کا لائٹر، کانا،
چند کیل وغیرہ تھے۔ نگاہیں اٹھا کر فصیح کو دیکھا۔
”سنو مائیکل اسکو فیلڈ! زیادہ اور اسمارٹ بننے کی
ضرورت نہیں ہے۔“ پھر گہری سانس لے کر لہجہ نرم
کیا۔ ”یہاں سے نکلنا ہے تو ہارون صاحب کے لیے
کام کرو۔ ایک ڈیڑھ سال کی بات ہے، پھر وہ تمہیں
آزاد کر دیں گے۔“

”ارے واہ۔ یہ سن کر تو میری آنکھیں بھر آئیں!“
وہ طنز سے بولا تھا۔ فصیح اسے گھورتا ہوا پلٹ گیا۔ میری
ساتھ آکر بیٹھی اور جب وہ دونوں تنہا رہ گئے تو ان
نوازشات کی بابت دھیمی سرگوشی میں بتانے لگی۔
”یہ سب مس آبدار نے بھجوا دیا ہے۔“ پہلے کی
طرح وہ اب سخت نہیں رہی تھی، شاید لمبی قید سے
تنگ آگئی تھی، ”مگر اس لڑکی سے بچ کر رہنا۔“
”ایک اور گڈ کاپ!“ اس نے شانے اچکائے۔

”نہیں سعدی!“ وہ اس کو سمجھا نہیں پارہی تھی۔
”وہ بری نہیں ہے، مگر وہ بہت چالاک ہے۔ دراصل وہ
خطرناک ہے۔ دیکھو، اس کے باپ کو مسز جواہرات
نے شادی کے لیے ٹھکرایا تھا، مگر ان دونوں کے
درمیان اب بھی بہت کچھ باقی ہے۔ دوستی، کاروبار،
چنگاریاں۔“

ذرا سانس لینے کو رکی۔ سعدی بے دلی سے سن رہا
تھا۔

”اور آبدار ہے تو بہت اچھی، مگر میں اس کے ساتھ
ہمیشہ غیر آرام دہ رہتی ہوں۔ اس نے اپنی ماں کو کم عمری
میں کھویا تھا۔ پھر امریکہ چلی گئی۔ سنا ہے وہاں ایک دفعہ
یہ ڈوبنے لگی تو ہاشم نے اس کی جان بچائی۔ تب ہاشم کی
شادی کو شاید ایک سال ہوا تھا۔ اس دن کے بعد سے
اس کا دل شہرین سے اچھا ہو گیا۔ اسے شہرین میں
صرف خامیاں نظر آتی تھیں، مگر میں گواہ ہوں، ہاشم
نے اس سے بے وفائی نہیں کی، نباہ کی بھی کوشش کی،
مگر آبدار۔ وہ ہاشم کے دل میں رہتی ہے، اس لیے اس
سے دور رہنا سعدی!“

”تو ہاشم نے اس سے شادی کیوں نہیں کی؟“ اسے
پہلی دفعہ دلچسپی محسوس ہوئی۔

”ہاشم اپنی طلاق اور باپ کی موت کے بعد سے
بہت مصروف رہا ہے، لیکن اب چونکہ وہ دونوں ایک
ہی شہر میں ہیں، وہ اسے اپنانے کا ضرور سوچے گا لکھ کر
رکھ لو۔“

”رکھ لیا۔ لیکن اگر ہاشم اس کی اتنی پرواہ کرتا ہے تو
اسے آبدار کو میرے پاس بھیجنا نہیں چاہیے تھا۔“
اسے جانے کیوں افسوس ہوا۔

”یہی تو میں سمجھ نہیں پارہی۔ ہاشم نے کیوں اسے
آنے دیا؟“

میری نے سر جھٹکا۔ تب ہی دروازے پہ آہٹ
ہوئی۔ میری جلدی سے کچن کی طرف چلی گئی۔ برقی
دروازہ کھلا اور اسے سرخ اسکارف کی جھلک دکھائی دی
تو اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اسی سپاٹ اور معصوم چہرے کے
ساتھ چلتی آرہی تھی۔ سعدی پہ ایک نظر ڈالی، ساتھ

موجود گارڈ سے مقامی زبان میں کچھ کہا اور آگے بڑھ گئی۔

چند لمحوں بعد وہ گارڈ کی معیت میں اسی دو کرسیوں والے کمرے میں داخل ہوا تو آبدار سینے پہ بازو لیٹے ادھر ادھر نہل رہی تھی۔ اس نے ابرو سے گارڈ کو جانے کا اشارہ کیا۔ وہ دروازہ بند کر کے چلا گیا تو وہ اس کی طرف گھومی۔

”تم نے کہا اللہ نے کسی آدمی کے سینے میں دو دل نہیں بنائے۔ تم نے ٹھیک کہا تھا۔ آدمی کے پاس ایک ہی دل ہوتا ہے، مگر میں آدمی نہیں ہوں۔“

”مطلب؟“ وہ مشتبہ نظروں سے اس کو دیکھ رہا تھا جو دروازے کی طرف پشت کیے کھڑی تھی۔

”دور نمبر فور“ مجھے کرنل خاور کی مدد کرنی ہے، سو مجھے تمہارے وکیل کا نام چاہیے، اگر تم مجھے بتاؤ تو میں تمہاری مدد بھی کروں گی، کیونکہ میرے دو دل ہیں، میں غیر جانب دار ہوں!“

”اور تم میرے لیے کیا کرو گی؟“ وہ اب بھی مشکوک نظریں اس پہ جمائے ہوئے تھا۔

”یہ فارس غازی نے تمہارے لیے بھیجا ہے۔“ اس نے سینے پہ لیٹے بازو کھولے اور ایک ہاتھ میں پکڑا تہہ شدہ کاغذ دھور سے دکھایا۔ وہ اس سے چند قدم کے فاصلے پہ کھڑی تھی۔

”میں کیسے یقین کروں کہ تم جھوٹ نہیں بول رہیں؟“

”میری شکل پہ لکھا ہے کہ میں جھوٹ نہیں بول رہی، خیر تم اس کی لکھائی پہچان لیتا، یہ اسی نے لکھا ہے۔ لیکن۔۔۔“ کاغذ والا ہاتھ پہلو میں گرالیا۔ ”میں تمہیں یہ تب دوں گی جب تم مجھے وکیل کا نام بتاؤ گے۔“ سعدی آنکھیں سکیڑے کتنے ہی لمحے اسے دیکھتا رہا۔

”فارس غازی کو معلوم ہے کہ میں کہاں ہوں؟ کس کے پاس ہوں؟“

”اس کو سب معلوم ہے۔ اب نام بتاؤ۔“ وہ جیسے فیصلہ کر کے آئی تھی۔

”تم سچ کہہ رہی ہو، ٹھیک ہے۔“ اس نے گہری سانس لی۔ ”لیکن میں وکیل کا نام صرف ہاشم کو بتاؤں گا۔“

”ہاشم درمیان میں کہاں سے آگیا؟“ اس کے ابرو نا خوشی سے بھنچے۔

”درمیان میں نہیں۔“ سعدی نے غور سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ اس وقت تمہارے پیچھے کھڑا ہے۔“

آبدار کرنٹ کھا کر دروازے کی طرف پلٹی۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔۔۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتی، سعدی نے ایک دم جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے کاغذ کھینچ لیا تھا۔ سب اتنی تیزی سے ہوا کہ اس نے اگلے ہی لمحے خود کو ششدر اور خالی ہاتھ کھڑے پایا۔

”قید خانہ انسان کو بہت کچھ سکھا دیتا ہے، مس!“ محظوظ سا مسکرا کر وہ چند قدم پیچھے ہٹا اور کاغذ کھول کر ایک نظر ان الفاظ پہ ڈالی۔ پھر نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ وہ شاک سے نکل آئی تھی اور غصہ اس کی آنکھوں میں ابھر رہا تھا۔ ”واپس کرو اسے۔“

”گارڈز کو بلا لو۔ وہی مجھ سے چھین سکتے ہیں اب یہ۔“

”او کے فائن“ اب تمہیں یہ مل گیا، اب مجھے نام بتا دو۔“ وہ ذرا بے بسی بھری خفگی سے سینے پہ بازو لیٹے بولی۔

سعدی نے ایک دفعہ پھر ان حروف کو پڑھا، کچھ دیر سوچتا رہا، پھر کاغذ اس کی طرف بڑھا دیا۔

”میں نے کہنا، ہاشم کو بتاؤں گا نام، تو اسی کو بتاؤں گا۔“ آلی نے آہستہ سے کاغذ تھاما۔ کچھ دیر لب کاٹتی رہی۔ غصہ قدرے کم ہوا۔

”تمہاری سمجھ میں آگیا وہ تم سے کیا کہنا چاہتا ہے؟ ہمیں کا کیا مطلب ہوا؟“ آبدار نے اپنی منہ سے استفسار کیا۔

”خود کشی!“ وہ جل کر بولا تھا۔ اس پیغام پہ جیسے اسے غصہ آیا تھا۔

”اس نے کہا تھا، یہ تمہاری آزادی کا پروانہ ہے۔“

”ان کا دماغ خراب ہے۔“

آبدار چند قدم آگے بڑھ کر اس کے سامنے آکھڑی ہوئی اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”اس آدمی کا دماغ ہرگز خراب نہیں ہے!“

”تم نہیں جانتیں فارس غازی کو۔“ وہ جھلایا تھا۔

”وہ ہاتھوں سے سوچتے ہیں ان کا غصہ ان کی ججمنٹ کو دھندلا دیتا ہے۔ اسی لیے ہمیشہ مصیبت میں پھنس جاتے ہیں۔ وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ میں یہاں اتنے مہینے سے قید ہوں ان کو معلوم ہے میں کہاں ہوں پھر بھی مجھے پہچانے نہیں آئے۔“ وہ شکوہ کر گیا تھا۔

”سعدی یوسف! مجھے نہیں پتا تم انسانوں کو کتنا پہچانتے ہو، لیکن میں ایک عامل تنویم ہوں مجھے انسانوں کو پڑھنا آتا ہے۔ اور جس فارس غازی سے میں ملی تھی وہ ویسا نہیں ہے جیسا تم اس کو جانتے ہو۔ شاید وہ ابھی ویسا رہا ہو، لیکن اب نہیں ہے۔ مجھے نہیں پتا ان حروف کا کیا مطلب ہے، لیکن تمہیں ایک بات ذہن میں بٹھالینی چاہیے۔“

اس کی بھوری آنکھوں میں ہمدردی سے جھانکتے آواز آہستہ کی۔

”تمہیں یہاں سے نکالنے کوئی نہیں آئے گا۔ نہ میں نہ فارس غازی نہ تمہارے خاندان میں سے کوئی اور۔ تمہیں یہاں سے صرف ایک شخص نکال سکتا ہے اور اس کا نام سعدی یوسف ہے۔ تمہیں اپنے آپ کو خود رہسکیو کرنا ہو گا۔“

”آپ کے گارڈز کی مہربانی سے انہوں نے میری لاک یک بھی آج چھین لی ہے!“

”لاک یک؟“ اس کی آنکھیں تعجب سے پھیلیں۔

”تمہیں لگتا ہے یہ لاک یک سے کھلنے والے دروازے ہیں؟ یہاں رہینا سنسز لگے ہیں سعدی یوسف! ان کو یہ گارڈز بھی نہیں کھول سکتے۔ ویسے میں نے تمہاری پروفائل پڑھی تھی جو فصیح نے بنا کر دی تھی۔ تم سعدی، تم فارس غازی نہیں ہو جو ہر لاک کھول لو گے یا ان گارڈز سے ہاتھ پائی کر کے یہاں سے بھاگ جاؤ گے۔ نہ تمہیں لڑنا آتا ہے نہ گن چلانی آتی

ہے نہ ان دروازوں کے قفل کھولنا آتے ہیں۔ فصیح نے بتایا تم نے ہاشم کے ڈاکو منٹس بھی چرائے تھے مگر تم کمپیوٹرز میں بھی اتنے اچھے نہیں ہو ان کی ان کرپشن کو بھی نہیں کھول سکے۔ نہ تم اچھے بلک میلر ہو۔ نہ ہی پڑھائی میں تم کوئی بہت ہی اعلا وارفع تھے۔ وہ ٹیلنٹ جو تمہارے ارد گرد کے لوگوں کے پاس ہے وہ تمہارے پاس نہیں ہے!“

سعدی کی آنکھوں میں شدید ناگواری ابھری۔

”سو تمہارا مطلب ہے مجھے کچھ نہیں آتا۔ ایک جو نلی جب تمہارے باپ نے مجھے قید نہیں کیا تھا اور میں اپنی دنیا میں رہ رہا تھا تب لوگ مجھے بہت پسند کرتے تھے۔“

”کبھی سوچا لوگ تمہیں کیوں پسند کرتے تھے؟ ہر شخص کے پاس ایک خاص ٹیلنٹ ہوتا ہے تم لاک ہکس جمع کرنا چھوڑ دو کیونکہ وہ تمہارا ٹیلنٹ نہیں ہے۔ تمہیں ایک ہی چیز کرنا آتی ہے زندگی میں اور اسی چیز کی وجہ سے لوگ تمہیں پسند کرتے ہیں۔“

سعدی کے ابرو تعجب سے اٹھے۔ ”کیا؟“

”تمہاری باتیں!“

”واٹ؟“ اسے عجیب سا لگا۔

”سعدی! تمہاری قائل کر لینے والی زبان ہی تمہارا سب سے بڑا ٹیلنٹ ہے۔ تم لوگوں کو کنوینس کر سکتے ہو۔“

”میں نہیں کر سکتا!“ اسے خود بھی یقین نہیں آیا تھا۔

”کیوں کیا تم نے ابھی مجھے کنوینس نہیں کیا کہ ہاشم میرے پیچھے کھڑا ہے؟“ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

آبی نے سر جھٹکا۔

”آل رائٹ۔ میرا کام ختم ہوا۔ تم جانو اور ہاشم جانے!“ وہ ایک گہری سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ نظر اس پر ڈالتی باہر نکل گئی۔

سعدی ناخوشی سے کھڑا ان ہی الفاظ کو سوچتا رہا۔



اپنوں کی مشکلوں سے بو جھل سادل ہے رتا

اکتوبر کے وسط سے موسم بدلنے لگا تھا۔ سرما کی پہلی دستک سنائی دے رہی تھی مگر تھانے کے اندر وہی خوف و وحشت اور تشدد کا موسم تھا۔ وہ ایک کمرے میں کرسیوں پہ بیٹھے تھے۔ (زمر کی وجہ سے اس کو چند سہولتیں مل جاتی تھیں جن میں یہ وقت بے وقت کی ملاقاتیں بھی تھیں۔) وہ خاموش سنجیدہ سا آنکھیں سکیڑے کراہر کو دیکھ رہا تھا، احمر وضاحت دے رہا تھا۔

”دیکھو مسز زمر نے واقعی مجھے ہار کیا تھا، لیکن تمہیں پھنسانے کے لیے نہیں۔ میں کلائنٹ پر یوج کے تحت تمہیں نہیں بتا سکتا تھا۔“

”کیوں ہار کیا تھا اس نے تمہیں؟“ اس کی چبھتی نظریں احمر پہ جمی تھیں۔

”وہ تو میں تمہیں اب بھی نہیں بتا سکتا، کیونکہ یہ ورک اینتھیکس کے خلاف ہے۔ اگر یہ تب غلط تھا، تو اب بھی غلط ہے۔ وہ بتا دیں تو الگ بات ہے۔ لیکن مجھے ہماری دوستی بہت عزیز ہے اس لیے میری طرف سے اپنا دل صاف کر لو۔“

”کر لیا اور کچھ؟“ اس کا لہجہ ٹھنڈا اور نگاہیں ہنوز پُر تپش تھیں۔ احمر گہری سانس لے کر پیچھے ہوا۔ پھر سوچتے ہوئے کندھے اچکائے۔

”مطلب تم واقعی سوچ سکتے ہو کہ۔۔۔ مسز زمر تمہیں یوں جیل بھجوا سکتی ہیں؟“

”میں بہت کچھ سوچ سکتا ہوں۔“

”مگر انہوں نے ایسا کچھ نہیں کیا غازی۔“

”تو ثابت کرو!“ وہ سپاٹ لہجے میں کہہ کر پیچھے کو ہو بیٹھا۔

احمر کی آنکھوں میں اچنبھا ابھرا۔ ”کیسے؟“

”مجھے ایک شخص سے ملنا ہے۔ صرف پندرہ منٹ کے لیے۔“ وہ کہہ رہا تھا مگر احمر کی آنکھیں پھیلیں۔

”فورا“ ہاتھ اٹھا کر روک۔

”دیکھو غازی! میں بے شک پرزن رائٹس پہ یقین رکھتا ہوں لیکن یہ رائٹس سے اوپر کی بات ہے۔“ پھر آواز بے چارگی سے نیچی کی۔ ”یار! تم حوالات میں ہو، پندرہ منٹ کے لیے بھی ہم تمہیں یہاں سے نہیں

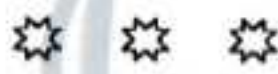
نکال سکتے۔“

”تمہارے پاس میرے جوڈیشل ریمانڈ تک کا وقت ہے۔ دو ہفتے!“ انگلیوں کی وی بنا کر دکھائی۔ ”مجھے اس شخص کے پاس جانا ہے۔ یا تو تم اور تمہاری کلائنٹ یہ سب اریج کر کے دو گے، یا میں خود جیل توڑ کر چلا جاؤں گا، کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔ کون سا آپشن بہتر ہے، اپنی کلائنٹ سے پوچھ کر بتا دینا۔“

وہ جتنی سنگینی اور قطعیت سے کہہ رہا تھا، احمر بے بسی سے اسے دیکھے گیا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے سوچا تھا کہ پرزن رائٹس جائیں جہنم میں، ارے ان قیدیوں کو تو الٹا لٹکا کر ورے مارے جانے چاہئیں۔

”کون ہے وہ شخص؟“

اس نے جیسے ہار پوچھا تھا۔



کئی بار دکھایا ہے ہمیں آئینہ وقت نے ڈرتے جو ہار سے ہم، بے کار بن کر جیتے انیکسی کے برآمدے میں نووارد سرما کی شام چھائی تھی۔ وہ نہیں تھا تو موسم کی گرم جوشی بھی ہر روز ناپید ہوتی جا رہی تھی اور خوف کا کمر فضا میں رچتا بستا جا رہا تھا۔ برآمدے میں آدھے بندھے گھنگھریالے بالوں والی زمر سینے پہ بازو لپیٹے کھڑی، سنجیدگی سے سامنے کھڑے احمر کو سن رہی تھی جو بے چارگی سے کہہ رہا تھا۔

”پلیز مجھ سے چلائیے گامت، مجھے قانون بھی مت سمجھائیے گا، مجھے معلوم ہے یہ سب کتنا غلط ہے مگر وہ اس سے ملنا چاہتا ہے۔“

بات ختم کر کے اس نے ڈرتے ڈرتے زمر کے تاثرات دیکھے۔ وہ خاموش کھڑی تھی، چہرہ نارمل تھا۔

”وہ اس سے اب کیوں ملنا چاہتا ہے؟ اتنا عرصہ جب وہ باہر تھا تب کیوں نہیں ملا؟“

”میں نے بھی یہی پوچھا تھا، وہ کہتا ہے کہ پہلے وہ آہستہ آہستہ کام کر رہا تھا، مگر اب وقت نہیں ہے۔“

پیا مبر نے ہچکچاتے ہوئے پیغام دیا۔

”نھیک ہے، وہ اس سے ملاقات کرنا چاہتا ہے، تو ہم کروادیں گے ملاقات!“ وہ گہری سانس لے کر بولی۔ احمر کا منہ کھل گیا۔

”واٹ؟ مطلب کہ۔۔۔“ پھر منہ بند کیا، خفگی سے اسے دیکھا۔ ”آپ کو اس کا مطالبہ برا نہیں لگا؟“

”نہیں۔ وہ سچائی جانتا چاہتا ہے، تو سچائی جاننے کا بہترین وقت دوران قید ہے۔ اگر وہ آزاد ہوتا تو کچھ کر بیٹھتا، لیکن اب اسے برداشت کرنا ہو گا۔“ زمر نے شانے اچکائے۔ وہ ساری جمع تفریق کر چکی تھی۔

”یعنی آپ سچائی جانتی ہیں؟ آف کورس، یہ میرا مسئلہ نہیں ہے“ وہ جلدی سے اپنی حد میں واپس آیا۔ ”مگر ہم اس کو حوالات سے نکالیں اور پھر واپس کیسے لائیں گے؟ یہ بہت خطرناک ہے!“

”میں کر لوں گی، تھوڑی سی آپ کی مدد چاہیے ہو گی۔ اور ہاں۔۔۔ ٹرائل کے لیے مجھے ایک انوسٹی گیشن کی ضرورت ہے۔ پچیس ہزار فی گھنٹہ راسٹ!“

ذرا نرمی سے پوچھا۔

احمر ادا سی سے مسکرایا۔ ”مجھے آپ سے کوئی رقم نہیں چاہیے۔ میں صبح آؤں گا، ہم تب معاملات ڈسکس کر لیں گے۔“ ذرا رکا۔ ”ویسے میں وہی ہوں جس کو ایک زمانے میں آپ کورٹ میں کھڑی پراسیکیوٹ کر رہی تھیں اور۔۔۔“

”احمر!“ اس کی ایک نظر کافی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ اٹھائے جلدی سے بولا۔

”آف کورس آپ کو یاد ہے۔ میں چلتا ہوں۔“

تب ہی برآمدے کا دروازہ کھول کر حنین تیزی سے باہر نکلی، احمر کو دیکھ کر ٹھٹکی۔ پھر ذرا کی ذرا خفا نظر اس پہ ڈالی۔ احمر الوداعی کلمات کہہ کر برآمدے کے زینے اترنے لگا۔ مگر وہ دیکھنے کا خشکیں سا انداز۔ بار بار اس کو کھٹک رہا تھا۔

کیمپن آفس میں بیٹھے وہ اسی سوچ میں گم تھا جب فاطمہ نے اس کے سامنے کافی کا مک رکھا۔ اور مقابلہ کر سی کھینچ کر بیٹھی۔ احمر نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ گلاسز لگانے والی گوری اور دلکش سی لڑکی تھی۔

”تمہارے خیال میں وہ مجھے ہر دفعہ اتنی ناگواری کیوں دکھاتی ہے؟“ اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔ فاطمہ نے گھونٹ بھرتے شانے اچکائے۔

”شاید تمہاری کسی بات سے ہرٹ ہوئی ہو۔“

”نہیں، میں نے تو دونوں دفعہ مختلف باتیں کہی تھیں۔ مگر مجھے ہمیشہ یہ لگتا ہے کہ وہ لڑکی۔۔۔ سعدی کی بہن۔۔۔ وہ مجھ سے۔۔۔ ان سیکور رہتی ہے، جیسے اسے مجھ سے کوئی خطرہ ہے۔“ نفی میں سر ہلاتے وہ جیسے الجھا ہوا تھا۔ ”اس لڑکی کے ساتھ کوئی مسئلہ ضرور ہے۔“

”احمر!“ فاطمہ آگے ہوئی اور دلچسپی سے بولی۔

”اس کیمپن میں ہم نے کتنے مسئلے حل کیے ہیں۔ کوئی پزل پہلے ہم سے بچ سکا ہے کیا؟“

”نہیں!“ وہ بھی دلچسپی سے آگے ہوا۔ ”ایسا کرو، اس لڑکی کے بارے میں ہر معلومات مجھے ڈھونڈ کر دو، تاکہ ہم کوئی لنک جوڑ سکیں۔“

”راجرباس، لیکن ہم یہ کیوں رہے ہیں؟ اس کی فیملی تو تمہاری دوست ہے نا۔“

”ہاں وہ میرے دوست ہیں، لیکن میں متجسس ہوں اور جب تک میں اس کو حل نہیں کروں گا، مجھے چین نہیں ملے گا۔“

وہ بہت بے چینی سے کہہ رہا تھا۔ فاطمہ نے ٹیک لگاتے سر کو خم دیا اور کافی کے گھونٹ بھرنے لگی۔



گروقت کبھی آتا باطل کی خدائی کا ہم موت سے نہ ڈرتے، تلوار بن کر جیتے کمرے میں ٹی وی کا بے ہنگم شور گونج رہا تھا۔ سعدی بیڈ پہ لیٹا تھا، پیر قینچی صورت بنارکھے تھے اور عدم دلچسپی سے دیوار پہ نصب اسکرین دیکھ رہا تھا۔ وی گووٹ اینڈ وی ڈارک نیس جو وہ کتنی ہی دفعہ گزرے برسوں میں دیکھ چکا تھا، اس قید خانے میں سخت کبیدہ خاطر لگ رہی تھی۔ (ٹی وی پہ صرف ڈی وی ڈی چلتی تھی، کوئی چینل نہیں آتا تھا۔)

اکتا کر اس نے ٹی وی بند کیا۔ کمرے کی خاموشی

عجیب لگنے لگی۔ اس نے سر ہاتھوں میں گر لیا اور سوچنے کی کوشش کی کہ وہ اتنا بے سکون کیوں ہے؟ مگر اگلے ہی لمحے چونکا۔

”اسکرین“ اسکرین میں سکون کب اور کس کو ملا تھا جو اسے تلے گا؟ بھٹکے وہ لی وی اسکرین ہو، کمپیوٹر اسکرین ہو یا موبائل اسکرین۔ اسکرین سستی بے سکونی اور بے زاری عنایت کرتی ہے اگر یہ اللہ کے ذکر سے خالی ہو! وہ اٹھا اور ہاتھ روم چلا گیا۔ کچھ دیر بعد گیلے ہاتھ پیر اور چہرے کے ساتھ باہر نکلا اور اپنا قرآن لے کر اسٹڈی ٹیبل پہ آ بیٹھا۔

”پتا ہے کیا اللہ تعالیٰ اس اسکرین کی نماز اور قرآن کے ساتھ ہمیشہ ایک جنگ چھڑی رہتی ہے۔ جتنی زیادہ ہمارے زندگیوں میں ”اسکرین“ آتی ہے اتنی ہماری نماز کم ہوتی ہے۔ اور جتنی نماز آتی ہے اتنی ہی اسکرین خود بخود جانے لگتی ہے۔ ہم بیک وقت دو دل نہیں رکھ سکتے۔ حیا سے عاری دل اور مومن کا دل یہ ایک سینے میں ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ خیر آج کون سی سورۃ پڑھوں؟“

اس نے صفحے پلٹتے سوچا۔ وہی بے ترتیب قرآن کی روٹین۔ وہ چند سورتیں آگے پیچھے سے پڑھتا تھا۔ آج بھی اس نے انمل کھول کر تعویذ اور تسمیہ پڑھا۔

”میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں دھتکارے ہوئے شیطان سے۔ شروع اللہ کے نام سے جو بہت مہربان بار بار رحم کرنے والا ہے۔“

اس نے آیات دیکھیں۔ ملکہ سبا کو سلیمان علیہ السلام کا خط مل چکا تھا اور اس کو پڑھنے کے بعد کا قصہ کچھ یوں تھا۔

”وہ کہنے لگی۔ اسے سردارو! مجھے میرے کام میں مشورہ دو تمہارے حاضر ہوتے ہوئے میں خود سے کوئی قطعی فیصلہ نہیں کرنے والی۔ انہوں نے کہا۔ ہم قوت والے ہیں اور سخت زور والے ہیں اور معاملہ تمہارے ہاتھ میں ہے تو دیکھ لو کہ تم کیا حکم دیتی ہو؟“

”سو کیا مطلب ہوا ان آیات کا؟“ سعدی دانت سے نچلا لبو دبائے سوچنے لگا۔

”سلیمان علیہ السلام کے مکتوب کریم جس میں لکھا تھا کہ میرے پاس مطیع و فرمان بردار بن کر چلی آؤ۔ اس کے بعد ملکہ اپنے سرداروں سے مشورہ لیتی ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ مشورے کے لیے یہاں پر ”افتویٰ“ کا لفظ استعمال ہے، یعنی مجھے فتویٰ دو۔ اللہ تعالیٰ آپ نے ”مشورے“ کا لفظ نہیں استعمال کیا۔ فتوے کا کیا۔ فتویٰ کہتے ہیں کسی مشکل مسئلے کے جواب کو۔ مجھے اس سے یہ سمجھ میں آیا ہے کہ فتویٰ ”جواب“ ہوتا ہے۔ جب مانگا جائے تب دیا جائے۔ یہ نہیں کہ جگہ جگہ اٹھتے بیٹھتے ہم ہر کسی پہ فتوے لگاتے جائیں اور ملکہ کا قصہ ایک طرف ہمارے ہاں ہر گلی کا مولوی اور ہر یونیورسٹی کا اسلامک پروفیسر بھی فتوے لگا دیتا ہے جبکہ اسلام میں ہر کوئی فتوے دینے کا اہل نہیں ہوتا ہے۔ مفتی کا مقام حاصل کرنے کے لیے خاص تقاضے پورے کرنے ہوتے ہیں۔“

وہ کہہ رہا تھا اور کمرے کا وحشت ناک سناٹا اب آہستہ آہستہ مسکنیت بھری خاموشی میں بدل رہا تھا۔

”ویسے انسان کو ہمیشہ مشورہ کرنا چاہیے“ مشورہ انسان کو رسوائی سے بچالیتا ہے۔ بہترین مشورہ اللہ سے مشورہ ہوتا ہے اور بہترین فتویٰ دل کا فتویٰ ہوتا ہے ”آخری فتویٰ خیر۔“

اس نے صفحے کو دیکھا۔

”ملکہ نے مشورہ مانگا تو سردار ان قوم نے اپنی طاقت بھی واضح کر دی اور آخری فیصلہ بھی ملکہ کے ہاتھ میں دے دیا۔ پھر آگے کیا ہوا؟“ وہ پڑھنے لگا۔

”وہ کہنے لگی کہ بے شک جب بادشاہ کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو وہاں فساد کرتے ہیں اور وہاں کے رہنے والے عزت دار لوگوں کو ذلیل کر دیتے ہیں۔ اور وہ اسی طرح کیا کرتے ہیں۔“ سعدی کو کچھ یاد آیا۔

”اللہ تعالیٰ یہ آخری الفاظ“ اور وہ اسی طرح کیا کرتے ہیں“ ان کے بارے میں دو آراء ہیں نا۔ پہلی رائے یہ ہے کہ یہ ملکہ کا ہی قول ہے مگر مجھے دو سری رائے زیادہ بھلی معلوم ہوتی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا تبصرہ ہے ملکہ کی بات پہ کہ واقعی طاقت کے نشے میں کم

لوگ دوسروں کی عزتوں کی پروا کہاں کرتے ہیں۔“
کمرے کی وحشت کسی حد تک کم ہو چلی تھی۔ اس
کا منتشر ذہن دھیرے دھیرے کئی دن بعد فوکس کرپا رہا
تھا۔ وہ عربی میں اگلی آیات پڑھنے لگا۔

”اور بے شک میں بھیجنے والی ہوں ان (سلیمان) کی
طرف ایک ہدیہ۔ پھر دیکھتی ہوں کہ ہمارے قاصد کس
چیز کے ساتھ لوٹتے ہیں۔“

”واہ ملکہ۔ مشورہ آپ نے ضرور مانگا سردار ان
قوم سے، لیکن آخر میں کی تو آپ نے اپنی ہی مرضی۔“
اس نے سوچا۔

”مجھے ہمیشہ یہ آیات پڑھتے ہوئے لگتا ہے کہ ملکہ
ایک تو اپنے سرداروں کو چیک کر رہی تھی، دوسرا وہ
جنگ کے بجائے امن کے پیغام کو جسٹنی فائی بھی
کر رہی تھی۔ چیونٹیوں کی ملکہ کی طرح وہ بھی اپنی قوم
کے لیے مخلص تھی، اور سب کا سوچتی تھی۔ وہ قطعی
فیصلہ کر سکتی تھی، مگر تھی وہ ایک عورت ہی، اس کو
ایک فیصلہ لینے سے پہلے بھی بہت سے لوگوں کو اس
فیصلے کی وضاحتیں اور صفائیاں دینا تھیں۔ وہ ملکہ ہو کر
بھی چیونٹی تھی، مگر وہ درست تھی۔ عورت اگر کبھی
خاندان میں دب بھی جائے، جارحیت کا جواب بھی صلح
صفائی سے دے، اور بظاہر چیونٹیوں کی طرح اندھی اور
خاموش زندگی بھی گزار رہی ہو، تو وہ بھی کوئی بری بات
نہیں ہوتی۔ بہت سے لوگوں کے سکون کے لیے اپنی انا
کی قربانی دینا برا کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟“

سعدی نے سر جھٹکا اور توجہ اگلی آیات کی طرف
مركزی۔

”تو جب وہ (قاصد) آئے سلیمان کے پاس (تحفے
لے کر) تو وہ کہنے لگے۔ ”کیا تم مال کے ذریعے میری مدد
کرنا چاہتے ہو؟ تو جو اللہ نے مجھے عطا کر رکھا ہے، وہ
اس سے بہتر ہے جو اس نے تم کو عطا کر رکھا ہے۔ بلکہ
اپنے تحفوں کے ساتھ تم خود ہی خوش ہوتے ہو۔
واپس جاؤ ان کے پاس، ورنہ البتہ ہم ضرور ان کے پاس
ایسے لشکر لائیں گے جن کے مقابلے کی طاقت ان میں
نہ ہوگی۔ اور ہم ان کو ان کی بستی سے ذلیل کر کے

نکالیں گے اور وہ پست ہو کر رہیں گے۔“
”سبحان اللہ!“ سعدی نے گہری سانس لی۔ ”تحفے
تحائف دینا پسندیدہ عمل ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم
دیا بھی کرتے تھے، لیا بھی کرتے تھے۔ مگر سلیمان علیہ
السلام نے کیوں یہ تحفہ قبول نہیں کیا؟ کیونکہ یہ
رشوت تھی۔ رشوت اس شے کو کہا جاتا ہے جو جائز کو
ناجائز یا ناجائز کو جائز بنانے کے لیے دی یا لی جائے۔
ملکہ کا تحفہ بھیجنا اس امر کی نشان دہی تھا کہ وہ معاملہ
خوشامد سے رفع دفع کرنا چاہتی تھی۔ مگر سلیمان علیہ
السلام ایسے پھندوں میں نہیں آتے تھے۔“ وہ رکا۔
”مگر وہ کیوں نہیں آتے تھے ایسے پھندوں میں؟ کیا
اس لیے کہ وہ پیغمبر تھے؟ نہیں، بلکہ اس لیے کہ۔۔۔“

اس نے آیت میں ہی جواب ڈھونڈا۔
”اس لیے کہ انہوں نے اپنی نعمتوں کے بارے میں
اعتراف کیا کہ یہ مجھے عطا کی ہیں اللہ نے۔ اور یہاں
ان کے لاؤ لشکر، جنات، پرواز کی سواریاں مراد نہیں
ہیں۔ یہاں مراد ہے پیغمبری۔ کتاب کا علم۔ اللہ کا
قرب۔ تو جو اللہ کے آگے سجدے میں سر رکھتا ہو، اس
کا سر ان پھندوں میں نہیں پھنستا۔ ان کی یہ ساری
شان، یہ انکار، یہ طریقہ، یہ ان کے اصولوں کی وجہ سے
تھا۔ اور اللہ، یہ تو مجھے کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ
کوئی پیغمبر کسی کو ذلیل نہیں کر سکتا، یہاں ذلیل کرنے
اور پست کرنے سے مراد جنگ کی خونریزی ہے۔
سلیمان علیہ السلام ملکہ کے پورے ملک کے عوام کی
آخرت کی فکر کر رہے تھے، اگر ملکہ اور سردار ان قوم
نے اسی طرح پورے ملک کو سورج کی پرستش یہ لگائے
رکھا تو اس قوم کو درست راہ دکھانے کے لیے حکمران
طبقے کو جنگ کے ذریعے ملک سے نکالنا بھی غلط کام نہ
تھا۔“

وہ آیات اتنی دلچسپ تھیں کہ سعدی کو وقت
گزرنے کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ حالانکہ اسے سب
یاد تھا کہ آگے کیا ہوگا، مگر قرآن ہر دفعہ انسان پہ نئے
طریقے سے کھلتا ہے۔ اب سلیمان علیہ السلام کے

دربار کا منظر بتایا جا رہا تھا۔

”سلیمان علیہ السلام نے کہا۔

”اے سردار! کون ہے تم میں سے جو ان کے مطیع ہو کر آنے سے قبل اس (ملکہ) کا تخت اٹھا کر میرے پاس آئے۔“ وہ لحظہ بھر کو ٹھہرا اور مسکرایا۔

”ملکہ نے بھی کہا یا بہا الملو (اے سردار) سلیمان علیہ السلام نے بھی کہا، یا بہا الملو (اے سردار) ملکہ نے بھی ان کی قوت چیک کی، سلیمان علیہ السلام نے بھی ان کی طاقت جانچنی چاہی، مگر دونوں کا انداز مختلف تھا۔ سلیمان علیہ السلام نے مشورہ نہیں مانگا، رائے نہیں مانگی، صرف جواب مانگا، کیونکہ جو وہ کرنے جا رہے تھے، وہ نبوت کا معجزہ تھا اور کچھ معاملے ایسے ہوتے ہیں جہاں آپ کو دوسروں کی آرا کے اثر سے نکل کر فیصلے کرنے ہوتے ہیں۔ سلیمان علیہ السلام نے بھی اپنی مرضی کی، ملکہ نے بھی اپنی مرضی کی، مگر مجھے ہمیشہ لگتا ہے کہ چونکہ وہ ایک عورت تھیں، اسی لیے اس کو صفائی اور وضاحتیں دینا پڑ رہی تھی۔“ پھر اگلے الفاظ پہ نظر دوڑائی۔

”کہا جنات میں سے ایک عفریت (دیو) نے، میں اس (تخت) کو لاؤں گا تیرے پاس تیرے اس جگہ سے اٹھنے سے قبل، اور بے شک میں اس پہ قوی اور امین ہوں۔“

”کس جگہ سے اٹھنے سے قبل؟“ سعدی نے آنکھیں بند کر کے یاد کرنا چاہا۔ چونکہ وہ عربی کا قرآن تھا، تفسیر لکھی ہوئی نہ تھی، اور دونوں سے اسکرین دیکھ دیکھ کر فوکس کم ہوتا جا رہا تھا۔ سو یہ وقت یاد آیا۔

”سلیمان علیہ السلام کا دربار صبح سے نصف النہار تک لگا کرتا تھا، جن کا مطلب تھا کہ دربار ختم ہونے سے پہلے لے آؤں گا۔ فلسطین، جہاں سلیمان علیہ السلام تھے، سے قوم سبا کے ملک کا فاصلہ ہزاروں میل پہ محیط تھا۔ وہ جن اس کو چند گھنٹے میں عبور کر سکتا تھا، مگر اس بے چارے کو بھی اس ہد ہد کی طرح اپنی امانت کی صفائی دینی پڑ رہی ہے کہ میں اس تخت کے ہیرے موتیوں سے کچھ چراؤں گا نہیں۔ سلیمان علیہ السلام کا

کتنا رعب تھا اپنی رعیت پہ۔ حضرت عمر بن خطاب فرماتے تھے کہ جو زیادہ ہنستا ہے اس کا رعب کم ہو جاتا ہے۔ مگر اپنے بیوں کی ساری باتیں ہمیں عین موقع پہ کیوں بھول جاتی ہیں؟“

گردن جھکائے رکھنے سے اس کی گردن دکھنے لگی تھی، مگر یہ طے تھا کہ پڑھتے وقت اس کو آگے پیچھے کا ہوش نہیں ہو سکتا تھا۔

”کہا اس شخص نے، جس کے پاس کتاب کا علم تھا، میں لاؤں گا اس (تخت) کو تیرے پاس تیرے پلک جھپکنے سے بھی پہلے۔“ (سعدی کو محسوس ہوا اس کے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے)۔ ”پھر جب دیکھا سلیمان علیہ السلام نے اس تخت کو اپنے پاس رکھا ہوا، تو کہا کہ یہ میرے رب کا فضل ہے، تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ کیا میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری کرتا ہوں۔ اور جو شکر کرتا ہے، تو یقیناً وہ شکر کرتا ہے اپنی ہی ذات کے لیے اور جو (یعنی کفران نعمت یا ناشکری) کرتا ہے، تو میرا رب تو بہت بے نیاز، بہت عزت والا ہے۔“

سعدی نے ہلکی سی جھرجھری لی۔ ہونٹ سکڑ کر سانس خارج کی۔

”یہ شخص کون تھا اور اس کے پاس کون سی کتاب کا علم تھا؟ آپ نے ہمیں یہ سب نہیں بتایا اللہ، بعض کہتے ہیں یہ خود سلیمان علیہ السلام ہی تھے مگر یہ قول کمزور ہے۔ زیادہ بہتر وہ رائے ہے کہ یہ ایک انسان تھا، اسرائیلیات اس کا نام آصف بتاتی ہیں، اس کے پاس کسی خاص کتاب کا علم تھا جو جادو نہیں تھا، اور وہ پلک جھپکتے میں تخت کو سلیمان علیہ السلام کے پاس لے آیا تھا۔ لوگوں کو عموماً یہ آیت بہت ہی fascinate

(فہمی نیٹ) کرتی ہے۔ مجھے اس سے اگلے الفاظ زیادہ فہمی نیٹ کرتے ہیں۔ پلک جھپکتے میں ہزاروں میل کا فاصلہ عبور کر کے تخت آجاتا ہے سلیمان علیہ السلام کے پاس، اور وہ کہتے ہیں یہ میرے رب کا فضل ہے۔ ہمارے پاس جب پلک جھپکتے میں ہزاروں میل دور سے کوئی ای میل، کوئی فیکس، کوئی ویڈیو کال آجاتی ہے، تو تو ہم کہتے ہیں یہ سائنس کا فضل ہے، اسکا پ

کا فضل ہے، اسکا پ کا فضل ہے۔ سوائی فانی کا فضل ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ سلیمان نے اس ذی علم شخص کی تعریف نہیں کی ہوگی، یقیناً کی ہوگی مگر پہلی تعریف اللہ کی بیان کی۔ یہ سب سائنس کے کرسٹے ہیں، اسکا پ وائی فانی سب، لیکن ہم پہلی تعریف اللہ کی بیان نہیں کرتے۔ اللہ ہمیں نعمتوں سے اس لیے نہیں نوازتا کہ ہم بہت نیک ہوتے ہیں، بلکہ اس لیے نوازتا ہے کہ ہم ان کے بعد بھی نیک رہتے ہیں یا نہیں۔ ذکر نعمتوں کی حفاظت کرتا ہے، اور شکر نعمتوں کو برہماتا ہے۔ اور اگر کوئی ناشکری کرے، اور اللہ آپ نے ناشکری کے لیے ”کفر“ کا لفظ استعمال کیا، تو اللہ ناشکروں سے بے نیاز ہے، اور ان کی تعریف کے بغیر بھی اتنا ہی باعزت ہے۔“

وہ عموماً ”اتنی طبی سوچ بچار نہیں کیا کرتا تھا، مگر فی الحال اس قصے کو بیچ میں ادھورا اچھوڑنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ کمرے میں چھائی ٹی وی کی نحوست وقت اور قید کا احساس سب ختم ہو کر رہ گیا تھا۔“

”سلیمان نے فرمایا، بدل ڈالو اس کے لیے اس کا تخت، ہم دیکھتے ہیں کہ وہ (ملکہ) ہدایت پاتی ہے یا بے ہدایت لوگوں میں سے ہو جاتی ہے؟ جو جب وہ آگئی، اس سے پوچھا گیا، کیا اسی طرح ہے تیرا تخت؟ بولی۔“

”گویا کہ یہ وہی ہے۔ اور ہم دیے گئے علم اس سے پہلے ہی اور ہم تھے اطاعت گزار۔“

”ان الفاظ میں کتنی وسعت ہے نا اللہ۔ ان کے بارے میں بھی دو آراء ہیں، ایک یہ کہ یہ پوری سطر ملکہ کا کلام ہے، دوسری یہ کہ ملکہ نے صرف تذبذب سے صرف اتنا کہا ”گویا کہ یہ وہی ہے۔“ صاف پہچانا بھی نہیں، صاف انکار بھی نہیں کیا، اور آگے کے الفاظ سلیمان علیہ السلام کے ہیں۔ یہ مجھے زیادہ بہتر رائے لگتی ہے۔ کاش قرآن پڑھنے والوں میں بھی اتنی ہی وسعت آجائے جتنی قرآن کی آیات میں ہے۔“

اس نے توجہ اگلے الفاظ کی طرف مبذول کی جہاں اللہ تعالیٰ فرما رہا تھا۔

”اور روکا تھا (ملکہ) کو اس (سورج) نے جس کی وہ

عبادت کرتی تھی اللہ کے سوا۔ بے شک وہ کافروں میں سے تھی۔“

”روکا تھا؟“ وہ ایک دم چونکا۔ ”اللہ کی عبادت کرنے سے آپ کو کیا چیز روکتی ہے؟ فجر کے وقت آپ کی آنکھوں پہ کیا چیز بوجھ ڈالتی ہے اور اٹھتے نہیں دیتی؟ صرف نیند میں اتنی طاقت نہیں ہوتی۔ یہ وہ چیزیں ہوتی ہیں جن کی آپ اللہ کے سوا عبادت کرتے ہیں۔ عبادت کہتے ہیں، عاجزی و انکساری سے کسی کے سامنے جھک جانے کو۔ مجھے یاد آ رہا ہے اللہ، آپ نے ایک قرآن میں بتوں کی عبادت کرنے والوں کے لیے یہ الفاظ استعمال کیے ہیں کہ ”کیوں ہو تم ان کے آگے جم کے بیٹھنے والے۔“ تو جس بری چیز کے آگے ہم جم کو بیٹھتے ہیں، مسموت، مسکور، مسکرزدہ، سے وہ ہمارے معبود ہوتے ہیں۔“

پلٹ کر ایک خفا نگاہ ٹی وی کی تاریک اسکرین پہ ڈالی۔

”اور جتنی زیادہ ان معبودوں کی مداخلت زندگی میں بڑھے گی، اتنی نماز کم ہوگی، یہ تو طے ہے۔“ پھر اس نے دھیان آج کے سبق کی آخری آیت پہ لگایا۔

”کہا گیا، ملکہ سے داخل ہو جا محل میں (جو شیشوں کا بنا تھا) تو جب اس نے دیکھا (اس شیشے کے فرش کو) سمجھی اس کو حوض، اور پنڈلیوں سے (لباس) اوپر اٹھالیا تو فرمایا سلیمان علیہ السلام نے، بے شک وہ ایک محل ہے چکنا شیشے کا بنا۔ تو کہنے لگی، اے میرے رب بے شک میں نے ظلم کیا اپنی جان پر اور میں اسلام لاتی ہوں سلیمان کے ساتھ، اللہ رب العالمین کے لیے!“

”شیشے کا محل!“ سعدی نے ٹھنڈی سانس بھرتے مقدس کتاب بند کی۔ ”کہتے ہیں اس محل کا کرشل کلینر گلاس کا فرش تھا اور اس کے نیچے پانی بہتا تھا۔ ملکہ جو پہلے ہی اتنی متاثر ہو چکی تھی، اس اعجاز کو دیکھ کر تسلیم کرنے پہ مجبور ہو گئی کہ سلیمان علیہ السلام، اللہ کے رسول ہیں، اور جس شے پہ وہ ہیں، وہ ٹھیک ہے، اور اس کی ساری زندگی کی عبادت اور ریاضت غلط تھی۔ میں نے اللہ تعالیٰ اس آیت سے ہمیشہ ایک بات

محسوس کی ہے۔ دین کی تبلیغ کرنے کے لیے صرف تقریر نہیں کرنی ہوتی، دوسروں کو متاثر بھی کرنا ہوتا ہے۔ سلیمان علیہ السلام نے برندے کے ذریعے خط، تخت کو لے آئے اور شفاف شیشے کے محل سے ملکہ کو متاثر کیا، کیونکہ سلیمان علیہ السلام کا معجزہ جنات، چرند پرند اور ایسی مخلوقات اور علوم کا مسخر کرنا تھا۔ انہوں نے اپنے معجزے سے ملکہ کو متاثر کیا۔ یہ قصہ بڑھ کر میرے جیسا عام انسان تھوڑا احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ بھی ہمارے پاس تو نہیں ہیں شیشے کے محل، اور جنات کے لشکر، اڑنے والے تخت، دربار اور بادشاہی۔ مگر۔ ہمارا معجزہ یہ شان و شوکت ہے بھی نہیں۔ ہماری امت کا معجزہ ہے ”قرآن“ اور ہمیں قرآن سے لوگوں کو متاثر اور مسحور کرنا ہوگا۔ کبھی قرآن سنا کر اور کبھی خود چلتا پھرتا قرآن بن کر۔ تب ہماری تبلیغ دھیان سے سنی جائے گی۔“

نظریں جھکا کر ہاتھ اٹھا کر وہ اب دعا مانگنے لگا۔ چونکہ تلاوت ختم ہو چکی تھی تو کمرے کی وحشت ویسی ہی محسوس ہونے لگی۔ گو کہ وہ پہلے سے بہت کم تھی۔ مگر وہ وہاں موجود تھی، یہ چیزیں تیزی سے ختم نہیں ہوا کرتیں۔

سعدی نے نوٹ بک اٹھائی اور اس پہ وہی الفاظ لکھے جو فارس نے لکھے تھے۔ Haman۔ سلیمان علیہ السلام نے ملکہ کے ملک کے لوگوں کی دنیا و آخرت بچائی اپنی ”نعمت“ استعمال کر کے۔ اس کو اپنی جان بچائی تھی اپنا ٹیلنٹ استعمال کر کے۔ اور وہ سرخ اسکارف والی لڑکی ٹھیک کہتی تھی۔ اس کو صرف ایک چیز یہاں سے نکال سکتی تھی۔ اس کی زبان۔ ایک عزم کے ساتھ اس نے ان حروف پہ کانٹا لگایا۔ مگر یہ صرف کانٹا نہیں تھا۔ یہ صلیب تھی!

یہ اداسیوں کے موسم یونہی رائیگاں نہ جائیں

کسی یاد کو پکارو، کسی درد کو جگاؤ
سرد دھیرے دھیرے شہر کو لپیٹ میں لے رہا تھا۔
انیکسی میں عجیب ہو کا عالم تھا۔ اسامہ نی وی سے بیزار
کونے میں اسکول کا کام لیے بیٹھا تھا۔ ابا کمرے میں
لپٹے تھے۔ ندرت نے ریٹورنٹ جانا چھوڑ رکھا تھا،
وہیں کچن میں گول میز پہ بے خیال، کھوئی کھوئی سی
بیٹھی رہتیں۔ روز زمر سے کہتیں ان کو فارس سے ملنا
ہے، پھر خود ہی ارادہ بدل دیتیں۔ ان کی نمازیں لمبی
ہو گئی تھیں۔ باتیں گھٹ گئی تھیں۔ سب کے کمروں
کی ترتیب بھی بدل گئی تھی۔ صداقت اب ابا کے
ساتھ سوتا تھا، سیم اوپر ندرت کے ساتھ، اور خنین زمر
کے ساتھ۔ کون کس سے خوف زدہ تھا، یا کون کس کا
خیال رکھنا چاہ رہا تھا، یہ سوچنے کے دن نہیں رہے
تھے۔

حنہ اس وقت نیچے تہہ خانہ میں تھی۔ اوپر زمر کے
کمرے کی جی مدھم تھی اور اندر وہ چہرے کے گرد دوپٹہ
لیپٹے بیٹھی نماز پڑھ رہی تھی۔ سلام پھیر کر اس نے خالی
خالی نظروں سے ویران کمرے کو دیکھا۔ خالی صوفے کو
دیکھا۔ اس کی ان چھوٹی الماری کو دیکھا۔ وہ ہوتا تھا تو
اس کی موجودگی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ وہ نہیں تھا تو
ہر شے گواہی دے رہی تھی کہ وہ نہیں ہے۔ کیسے اس
کے خاندان نے چار سال گزارے ہوں گے اس کے
بغیر؟ زمر کا سر جھک گیا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس
نے ہاتھ پیالہ سوالی کی صورت اٹھائے۔

”میں نے بہت غلط کیا اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ۔ وہ
بے گناہ تھا مگر میں نے اس کا اعتبار نہیں کیا۔ میں نے
اس کو اس جہنم سے نہیں نکالا۔ میں کیسے اس احساس
جرم سے نکلوں؟ وہ اچھا انسان ہے مگر مجھے اس سے
کوئی محبت، کوئی نفرت کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ جانتے
ہیں، دل میں اب بھی اسے پسند نہیں کرتی۔ مگر
مجھے اس سے ہمدردی ہے۔ پلیز میری مدد کریں۔ کوئی
راستہ نکالیں۔ مجھ سے بات کریں۔“

آنسو ٹپ آنکھوں سے گر رہے تھے۔ دل بھی
دکھی تھا۔ تب ہی سیڑھیاں چڑھنے کی آواز آئی، اور وہ

اپنے خاندان کے ہر بندے کی مختلف چاپ پچانتی تھی۔ فوراً آنکھیں رگڑیں۔
دروازہ کھلا اور حنین اندر داخل ہوئی۔ پھر بیڈ پہ گرنے کے سے انداز میں لیٹ گئی۔ دفعتاً گردن اونچی کر کے اسے دیکھا۔ وہ جائے نماز تہ کر کے کھڑی ہو رہی تھی۔

”میں کتنی دیر پہلے آئی تھی، آپ تب بھی نماز پڑھ رہی تھیں۔“

”اتنا وقت تو لگ ہی جاتا ہے۔“ وہ رسان سے کہتی میز پہ جائے نماز رکھ کر دوپٹے کو کھولنے لگی۔ حنہ کہنی کے بل اونچی ہوئی اور ہتھیلی تلے گال رکھ کر اسے دیکھا۔

”آپ اتنی لمبی نماز میں کیا پڑھتی ہیں؟“
”ساری مسنون دعائیں!“ وہ سرخ موڑے کھڑی اب دوپٹے سے بال آزاد کر رہی تھی۔

”کون سی ساری دعائیں؟ میں تو سبحنک الہم پڑھتی ہوں، پھر سورہ فاتحہ، پھر پھر قل ہو اللہ، پھر رکوع سجدہ التحیات، درود، رب اجعلنی اور پھر سلام۔“
منٹ بھر میں حنہ کی نماز ختم ہو گئی تھی۔

”تم ہر اسٹیپ کی صرف ایک دعا پڑھتی ہو؟“ وہ اسی طرح سرخ موڑے بال برش کرنے لگی۔

”ہاں، تو ہر اسٹیپ کی ایک ہی دعا ہوتی ہے، ہمیں مولوی صاحب نے ایسے ہی سکھائی تھی بچپن میں۔“
زمر اس کی طرف گھومی۔ آنکھوں کا گلابی پن اب کم تھا۔ ”اور مولوی صاحب نے کہاں سے سیکھی تھی نماز؟“

”اپنے مولودی صاحب سے۔ سوری۔ مطلب حدیث کی کتابوں سے۔“ گڑبڑا کر تصحیح کی۔

”ہم سب کو نماز سکھائی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ انہوں نے ہر اسٹیپ کی کئی دعائیں سکھائی تھیں۔ یہ بھی فرمایا کہ جو تین دفعہ سبحان ربی الا علی سجدے میں پڑھتا ہے تو اس کا سجدہ تو ہو جاتا ہے، مگر وہ ادنیٰ درجے کا ہوتا ہے۔“

”کیا مطلب؟ ہم سبحان ربی الا علی نہ پڑھا کریں؟“

”اف! میں نے یہ کب کہا نہ پڑھا کریں۔ یہ تو لازمی ہے پڑھنا۔ مگر رکوع و سجود کو ”اعلا“ یعنی بہترین بنانے کے لیے دوسری دعائیں بھی پڑھنی ہوتی ہیں۔ نماز ان کے بغیر بھی ہو جاتی ہے، مگر ان کے ساتھ زیادہ اچھی ہوتی ہے۔“

”دوسری دعائیں؟“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ایک دم پریشان۔ ”ہاں بھائی بھی شاید پڑھتا تھا، مگر مولوی صاحبان کیوں پوری نماز نہیں سکھاتے!“

”کیونکہ وہ ایک چھ سال کے بچے کو ایک دم بوجھل نہیں کرنا چاہتے اور یہ گمان کرتے ہیں کہ بڑا ہو کر خود ہی سیکھ لے گا۔ یہ ساری دعائیں احادیث کی صحیح کتب میں درج ہیں جن میں کوئی شک کی گنجائش نہیں۔ مگر بڑے ہو کر کوئی نہیں سیکھتا کیونکہ نوے فیصد مسلمانوں کو علم ہی نہیں ہوتا کہ نماز کی اور دعائیں بھی ہیں۔ یا یہ کہ قل ہو اللہ کی جگہ قرآن کی دوسری سورتیں بھی پڑھی جاسکتی ہیں۔“ وہ وہیں ڈیسر کے اسٹول پر بیٹھی بال برش کرتے کہہ رہی تھی۔

حنین الجھ گئی تھی۔ ”تو وہ جو ہم سنتے ہیں کہ ہمارے بزرگ لمبی لمبی نمازیں پڑھتے تھے، وہ اس لیے کہ وہ ان میں تمام دعائیں پڑھتے تھے؟“

”بالکل۔“
”میں سمجھی الفاظ شہر شہر کر پڑھتے ہوں گے۔ سوری۔“ وہ ذرا شرمندہ ہوئی۔ ”اچھا، مجھے بھی بتائیں، کون سی دعائیں پڑھنی ہیں۔“

”حنہ!“ وہ حنہ کی طرف گھومتے اپنے مخصوص انداز میں مسکرائی۔ ”تم ایک باشعور بڑھی لکھی لڑکی ہو۔ تمہیں نصیحت کرنا میرا کام ہے، تمہارے منہ میں نوالے بنا کر دینا میرا کام نہیں ہے۔ میں ناصح ہوں، استاد نہیں۔ تم اگر ناؤلز پڑھ سکتی ہو، کمپیوٹر استعمال کر سکتی ہو، تو تم احادیث کی کتابیں بھی خود کھول کر ساری دعائیں یاد کر سکتی ہو۔ تمہیں اپنی نماز کو اعلا بنانے کے لیے خود محنت کرنی ہوگی۔“

”اچھا!“ اس کا چہرہ اتر گیا۔ (ایک دو دعائیں بتا دیتیں تو کیا ہوتا؟)

”اور تم بالکل بھی نماز نہیں پڑھتی ہو حند۔“ اس نے نرمی سے کہا تھا۔ حنین لب کاٹتے بستر پر لکیریں کھینچنے لگی۔

”دیکھیں میں فجر پہ نہیں اٹھ پاتی۔ فجر نہ پڑھوں تو باقی پڑھنے کا کیا فائدہ؟“

”قائدے نقصان کے لیے نماز نہیں پڑھی جاتی، ایک سرساز اور صحت کے لیے بھی نہیں پڑھی جاتی نماز اللہ کو خود سے راضی رکھنے کے لیے پڑھی جاتی ہے۔ دیکھو جلب کرنا یا نہ کرنا ایک اچھی مسلمان اور ایک کم اچھی مسلمان لڑکی میں فرق کرتا ہے، سچ اور جھوٹ مومن اور منافق میں فرق کرتا ہے، مگر نماز مسلمان اور کافر میں فرق کرتی ہے۔“

”یار! اب ایک دم سے مجھے کافر تو نہ بنا دیں۔“

”سوری حند! مگر یہ بات میں نہیں کہہ رہی۔ یہ حدیث کی کتابوں میں لکھی ہے۔ نماز کے بغیر ہم مسلمان کیسے ہو سکتے ہیں؟“

”مگر زمر! مجھ سے فجر نہ نہیں اٹھا جاتا۔ آپ کو لگتا ہے کہ میں کوشش نہیں کرتی؟ کرتی ہوں۔ الارم بجتا ہے، امی بھائی سب اٹھاتے ہیں۔ میں نہیں نہیں نہیں اٹھ سکتی۔“ وہ روہانسی ہوئی۔

”الارم کلاک ہاتھ روم میں رکھ کر سویا کرو۔ اٹھ جاؤ گی۔“ ایک وقت کے لیے اتنی نصیحت کافی تھی وہ بل لپیٹتے اٹھی۔ ”اب بتاؤ جو کام میں نے تمہیں دیا تھا وہ کر لو گی؟ اچھا اب یوں دل مسوس کرنے بیٹھو تمہیں تو اتنی ساری قرآن کی سورتیں حفظ ہیں جب تک نماز کی دعائیں نہیں ملتیں ان ہی کو سورہ اخلاص کی جگہ پڑھ لیا کرو۔ یاد تو ہیں نا وہ؟“

”وہ؟“ وہ چونکی۔ ”جی جی یاد ہیں۔“ جلدی سے نگاہیں جھکائیں اور ٹیبلٹ سامنے کر لیا۔

ایک حافظ قرآن کے لیے کسی دوسرے کو یہ بتانا یا سمجھانا کہ وہ قرآن بھول چکا ہے، بہت مشکل، بہت تکلیف دہ تھا۔



خود کو سنتے ہیں اس طرح جیسے

وقت کی آخری صدا ہیں ہم اس رات سعدی اپنے کمرے میں آنکھوں پہ بازو رکھے لیٹا، نیند میں تھا جب ایک دم اس کے وجود میں بے چینی سی پھیلی۔ وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ چہرے پہ ہاتھ پھیرا۔ اف۔ دی گوسٹ اینڈ وی ڈار کنہیں اتنی دفعہ دیکھنے کے باعث خواب بھی جنگلوں اور شیروں والے آرے تھے۔ وہ قلم کا منظر مسلسل پوری رات خواب میں دیکھتا رہا تھا۔ کیا زندگی میں یہ عارت گر کم تھے جواب خواب میں بھی ان ہی کو دیکھنا ہو گا؟ وہ دائیں جانب کروٹ لیتے کال تلے دونوں ہاتھ رکھے، اسی قلم کی کہانی سوچنے لگا۔ وہ نیشنل جیو گرافک ٹائپ کے چینل نہیں دیکھتا تھا، اس کا خیال تھا کہ انسانوں کے مسائل زیادہ توجہ طلب ہیں۔ مسز کاردار دیکھتی تھیں ایسے شوز۔ اکثر اس کو بتایا کرتیں۔

وہ سونے کی کوشش کرتے ہوئے آنکھیں موندے گھوم پھر کر اسی نہج پہ سوچنے لگا۔ جواہرات۔ وہ ماہ عارت گر کی کہانی۔ اور اگلی ملاقات میں اس کی اتنی بے عزتی کرنا۔ وہ میری سے بات کر رہا تھا۔ ان کو اچھا نہیں لگا تھا۔ اس کا ذہن نیند میں ڈوب رہا تھا۔ میری کے الفاظ کی بازگشت ہر سوسنائی دے رہی تھی۔ وہ مجھ سے خائف رہتی تھیں سعدی! جیسے ان کو مجھ سے کوئی ڈر ہو۔ ان کی ایماء فینونا نے مجھے نوکری سے نکلوایا۔ آخری دفعہ میں ان کو دیکھا تھا۔ اور نگ زیب کے ہاتھ روم کے پچھلے دروازے سے نکلتے۔ پچھلے دروازے۔ بیک ڈور۔ پچھلا دروازہ۔

وہ ایک دم بجلی کی سی تیزی سے اٹھ بیٹھا۔ اس کا سانس تیز تیز چل رہا تھا اور چہرے پہ پسینہ تھا۔ گھبرا کر وہ بستر سے اتر ا اور ساری بٹیاں جلا دیں۔ پیشانی پہ ہاتھ پھیرا۔ جسم کانپ رہا تھا۔

پھر جلدی سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ چست گارڈ نے فوراً کھولا۔

”میری کو بلاؤ۔“ وہ ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔ گارڈ نے آواز دی۔ میری نیند سے بھری آنکھوں سے بھاگتی آئی۔

”کیا ہوا؟“ وہ پریشان ہو گئی تھی۔ سعدی نے اسے اندر آنے دیا اور پھر دروازہ بند کر دیا۔
”اس کمرے میں کوئی سننے کا آلہ کوئی ریکارڈر تو نہیں ہے نا؟“

”نہیں۔ یہ لوگ اتنے فارغ نہیں ہیں کہ تمہاری باتیں سنیں۔ کیا ہوا ہے؟“
”تم نے مسز کاردار کو اورنگ زیب کاردار کے ہاتھ روم سے نکلتے دیکھا تھا؟“ وہ سانس روکے اس کو دیکھتے پوچھ رہا تھا۔
میری کے چہرے کا رنگ بدلا۔ آہستہ سے صوفے پہ بیٹھی۔ ”ہاں۔“

وہ تیزی سے اس کے سامنے بچوں کے بل بیٹھا۔
”اگر مسز کاردار کے وہاں سے نکلتے وقت اورنگ زیب زندہ تھے تو انہوں نے وہ دروازہ ضرور لاک کیا ہوگا۔ میں نے سنا تھا ہاشم نے ہاتھ روم کا دروازہ توڑ کر مردہ باپ کو وہاں سے نکالا تھا۔ یاد کرو میری! یاد کرو۔ دروازہ توڑنے سے پہلے پچھلا دروازہ چیک کیا تھا کسی نے؟“

”وہ لاکڈ تھا۔“ میری خواب کی سی کیفیت میں بولی تھی۔
”کسی نے چیک کیا تھا؟ تم نے؟“
”میں کرنے لگی تھی، مگر مسز کاردار نے مجھے نو شیرواں کو بلانے بھیجا انہوں نے ہی چیک کیا تھا۔“
سعدی نے تھکی تھکی سانس اندر کھینچی۔ ”اور جب دروازہ ٹوٹا تو؟“

”تو میں نے دیکھا، پچھلے دروازے کی کنڈی کھلی تھی۔ سعدی! میں فلمینو میڈ ہوں، میں گھر کے چپے چپے نظر رکھتی ہوں، مجھے اچھی طرح یاد ہے کنڈی کھلی تھی، مگر جب میں ڈاکٹر کو کال کر کے آئی تو کنڈی بند تھی۔“ وہ اب بھی گویا نیند میں بول رہی تھی۔
”اور تمہیں ڈاکٹر کو کال کرنے مسز کاردار نے بھیجا ہوگا؟“ میری نے اثبات میں سر ہلایا۔ سعدی اٹھا اور اسٹڈی ٹیبل کی کرسی کھینچ کر بیٹھا۔ وہ گہری سوچ میں گم لگتا تھا۔

میری جیسے نیند سے جاگی۔ ”تم بھی وہی سوچ رہے ہو جو میں سوچ رہی ہوں سعدی؟“
”شش!“ اس نے ہونٹوں پہ انگلی رکھی۔
”دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں میری! اور یہ بات کسی اور کو نہیں معلوم ہونا چاہیے۔“ پھر انگلیاں بالوں میں پھنساتے سر نیچے گرالیا۔ میری اب بھی بے یقین تھی، مگر وہ حیران نہیں تھی۔
”میں پچھلے ڈیڑھ دو سال سے یہی سوچتی آئی ہوں سعدی! مگر میں اتنا بڑا نتیجہ نکالنے سے ڈرتی تھی۔“ اس نے جھرجھری لی۔

”تم یہاں سے نکلنا چاہتی ہو میری؟“ اس نے ایک دم سراٹھا کر پوچھا تو میری کو اس کی آنکھوں میں چمک نظر آئی تھی۔
”مجھے صرف اپنی ملازمت واپس چاہیے۔“
”ٹھیک ہے، ہم اس معلومات کو استعمال کریں گے۔“

”چھوڑو اس سب کو سعدی! بھول جاؤ۔“ وہ خائف ہوئی۔ سعدی زخمی سا مسکرایا۔
”میری! یہ طے ہے کہ ہم میں سے ایک سولی چڑھے گا اور دوسرا اپنے پرانے مقام پہ واپس آجائے گا۔ تم خطرہ مول لینے کو تیار ہو میری؟“
میری نے تذبذب سے اثبات میں سر ہلایا۔ سعدی نے سر پھر سے ہاتھوں میں گرالیا۔ نیند جانے کتنے دن کے لیے اڑ چکی تھی۔ اسے ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ دو سال کیوں نہ سمجھ سکا؟



ان ہی خوش گمانیوں میں کہیں جان سے بھی نہ جاؤ وہ جو چارہ گر نہیں ہے اسے زخم بھی کیوں دکھاؤ؟
سرا کی اس سہ پہر ملاقاتی کمرے میں وہ جیسے ہی داخل ہوا، نگاہ سامنے بیٹھی سارہ اور امل پہ پڑی۔ فارس کی آنکھوں میں تفکر ابھرا۔ زمر کا ایک اور احسان کہ سپاہیوں نے انہیں اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ سارہ نے سراٹھا

کر اسے دیکھا۔ سفید دوپٹے کے ہالے میں اس کا چہرہ زرد سا لگتا تھا۔ سر کے خم سے سلام کیا۔ اٹل بھاگتی ہوئی آگے آئی اور اس سے لپٹ گئی۔ اس نے جھک کر اسے گلے لگایا، پھر ساتھ لیے سامنے آ بیٹھا۔ وہ خوش نہیں لگ رہا تھا۔

”آپ کو ادھر نہیں آنا چاہیے تھا۔“
”تمہیں لگتا ہے میں آنا چاہتی تھی؟“ سارہ کی آنکھوں میں شکوہ ابھرا۔ ”اٹل پاگل ہو رہی تھی تمہارے لیے۔ یہ پہلی دفعہ نہیں ہے جب تم اسے چھوڑ کر گئے ہو۔“ نہ گلہ نہ شکوہ۔ بس وہ دکھی تھی۔ فارس کے چہرے کا بناؤ قدرے کم ہوا۔ گردن جھکا کر دیکھا۔ وہ بالوں کی اونچی پونی باندھے، ٹھوڑی سینے سے لگائے، اس کے ہاتھ کے زخم کے نشان پہ انگلی پھیر رہی تھی۔

”آپ کیسی ہیں؟“ نگاہیں اٹھا کر سنجیدگی مگر نرمی سے سارہ کو مخاطب کیا۔

”تم جیل میں ہو، ہم سب کیسے ہو سکتے ہیں۔ تم باہر تھے تو ایک سکون تھا، پتا نہیں کس چیز کا مگر سکون تھا، اب نہیں رہا۔“

”میں غصہ ہوں، میں خفا ہوں تم پہ فارس!“ وہ بے بس سی اس کو دیکھ کر کہہ رہی تھی جس کی شیوڈرا بڑھی تھی اور ہونٹوں پہ کٹ کا نشان تھا، مگر آنکھوں میں وہی سپاٹ پن تھا۔ ”کیوں بار بار مصیبت میں پھنس جاتے ہو؟ ہمیں کب یقین ہو گا کہ تم اب ہمیں چھوڑ کر نہیں جاؤ گے؟“

وہ ہلکا سا مسکرایا۔ ”سب ٹھیک ہو جائے گا سارہ۔“
”پتا نہیں سب کب ٹھیک ہو گا۔ جو سعدی کے ساتھ ہوا، جس طرح ان لوگوں نے اس کو گولیاں ماریں، پھر اس کو جانوروں کی طرح پیٹا۔“ سارہ کی

آنکھیں بولتے بولتے گلابی ہوئیں۔ ”پھر اس کو اغوا کر کے لے گئے۔ یہ سب پتا نہیں اب کس کس کے ساتھ دہرایا جائے گا۔“

پھر سر جھٹکتے ہوئے ایک پیکٹ اٹل کی طرف

برہایا۔ ”اٹل! دو چاچو کو۔“ اور وہ جو سارہ کی بات پہ ایک دم سے اسے دیکھنے لگ گیا تھا، ذرا چونکا۔ اٹل نے فوراً ”پیکٹ تھاما اور اس کو تھمایا۔“

”یہ پایا کا سویٹر ہے۔ ماما نے کہا، سردی بڑھ گئی ہے بارشوں کے بعد سے، تو آپ کو چاہیے ہو گا۔“ وہ شرمنا کر کہہ رہی تھی۔ فارس نے ایک نظر ہاتھ سے بنے بھورے سویٹر کو دیکھا، پھر اس کے سر کے بال ہولے سے تھکے۔ بولا کچھ نہیں۔

”اپنا خیال رکھنا فارس!“ وہ اب جانے کے لیے اٹھ رہی تھی۔ فارس بھی کھڑا ہو گیا۔

”عجیب بات ہے سارہ! سعدی کے بارے میں سوشل میڈیا، پولیس، رپورٹرز سب نے کہا تھا کہ اسے ”پہلے“ مارا پیا گیا، گولی ”بعد“ میں ماری گئی، کیونکہ گولیاں عموماً آخر میں ہی ماری جاتی ہیں، مگر اس کے ڈاکٹر نے ایک دن یونہی مجھے بتایا کہ ایسا لگتا ہے جیسے اسے ”پہلے“ گولیاں ماری گئیں، پھر مار پیٹ کی گئی۔“
”اس میں عجیب کیا ہے؟“ وہ واقعی نہیں سمجھی تھی۔ فارس اس کی آنکھوں کا رنگ دیکھتے ہوئے ہلکا سا مسکرایا۔

”صرف یہی کہ آپ کو بھی درست ترتیب معلوم ہے۔“ سارہ کا سانس ایک دم ٹھم گیا۔
”نہیں، میں تو بتا سوچے بول رہی تھی۔ اب تو اپنی کسی باتیں خود بھی نہیں یاد رہیں۔ بہ دقت مسکرائی۔“
”آف کورس، میں تو یونہی کہہ رہا تھا۔“ فارس نے سر کو خم دے کر احترام سے اس کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔



سارہ کے جانے کے تقریباً ”آدھے گھنٹے بعد وہ زمر کے ساتھ اسی کمرے میں بیٹھا تھا۔ سارہ کے برعکس وہ جو اس ماحول کی عادی تھی، سامنے بیٹھی سنجیدگی سے نوٹ پیڑ پہ فلم گھسیتی اسے کل کا لائحہ عمل لکھ کر بتا رہی تھی۔ (دیواریں کے کانوں کی کیا خبر) ساتھ ہی بار بار شیشے کی چھوٹی بول سے پانی کا گھونٹ بھی بھرتی

اور رکھ دیتی۔
”چونکہ بد قسمتی سے میں تمہاری وکیل ہوں، اس لیے اپنے اور قمر الدین صاحب کے تعلقات کی تفصیل بتاؤ مجھے۔“

”مجھے یاد نہیں۔“ وہ بے زاری سے سر جھٹک کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

”فارس! ایسے نہیں چلے گا۔ میں تمہارا کیس کیسے لڑوں گی جب تم مجھے کچھ بتاؤ گے ہی نہیں؟“

”تو مت لڑیں۔ میں نے نہیں کہا لڑنے کو۔“ اس نے سنجیدگی سے اسے دیکھتے شانے اچکائے۔ زمر نے بمشکل ضبط کیا۔

”میری بھی مجبوری ہے فارس غازی! کیونکہ میں نہیں بھولی کہ ہم ایک ٹیم ہیں! اس لیے مجھے کچھ تو بتاؤ تاکہ میں ٹرائل کی تیاری کر سکوں۔“

وہ ٹیک لگائے، ٹانگ پہ ٹانگ جمائے، اسے دیکھتا رہا۔ ”مجھے یاد نہیں۔“

”پھر سڑو حوالات میں!“ وہ کھول کر اٹھی، شیشے کی بوتل اور فائلز اٹھائیں اور دروازے کی طرف بڑھی۔ ”جیسے اس ملک میں واقعی قانون نام کی کوئی چیز ہے۔“ وہ سر جھٹک کر بیڑیا لیا تھا۔

زمر دروازے پہ رکی۔ مڑی نہیں۔ ”کیا کہا تم نے؟“

”جائیں زمر بی بی! میرے پاس آپ سے بحث کرنے کا وقت نہیں ہے۔“ اس نے ناگ سے مکھی اڑائی۔

زمر دو قدم آگے آئی، فائلز میرے دھریں اور غرائی۔ ”میں نے پوچھا۔ کیا۔ کہا تم نے۔“

”میں نے کہا، جیسے اس ملک میں واقعی قانون نام کی کوئی چیز ہے۔“

زمر کے کان سرخ پڑ گئے، چہرہ دہکنے لگا۔ خالی ہاتھ

اور بوتل والا ہاتھ میز پہ رکھ کر آگے کو جھکی۔

”کیسے کہہ سکتے ہو تم کہ اس ملک میں قانون نہیں ہے؟ اس ملک میں کوئی قانون پہ چلنے والا نہیں ہے؟“

اگر اس ملک میں کوئی ایمان دار نہ ہوتا تو تمہارا بھائی کیسے ایمان دار تھا؟ یہ ملک زندہ کیسے ہے اگر اس میں قانون نہ ہو؟ اور پلیز، مت شروع کرنا میرے سامنے اپنے ٹرائل کا ذکر۔ ہاں ٹھیک ہے، نہیں ہوا تمہارا فیئر ٹرائل، تم بری بھی بلیک میلنگ کے ذریعے ہوئے تھے۔ تمہیں ”انصاف“ نہیں ملا عدالت سے، لیکن اپنے اس بد دماغ سے دماغ میں یہ بات بٹھالو فارس غازی! کہ اس ملک، بلکہ دنیا کے ہر ملک کی عدالتیں ”انصاف کی عدالتیں“ نہیں ہوتیں، وہ ”قانون کی عدالتیں“ ہوتی ہیں۔ اگر اس ملک میں قانون نہ ہوتا تو مجرموں کو ملک سے راتوں رات بھاگنا نہ پڑتا، لوگ گواہوں کو نہ خریدتے، پاسپورٹ پہ بیک ڈیٹ میں ایگزٹ اسٹیمپ نہ لگاتے۔ اگر اس ملک میں قانون نہ ہوتا تو مجرم دھڑلے سے جرم کر کے عدالت میں تسلیم بھی کر لیتے مگر کوئی۔ کوئی نہیں تسلیم کرتا عدالت میں، کیونکہ اسے پتا ہے اگر تسلیم کر لیا تو فیصلہ قانون کے مطابق ہوگا۔ اسی ملک میں عدالتوں نے کئی دفعہ ہر خطرے اور ہر دھمکی سے بے خوف ہو کر بڑے بڑے نذر فیصلے بھی کیے ہیں۔ اسی ملک میں بڑے بڑے لوگوں کو ان چھوٹے چھوٹے ججز نے جیل بھیجا ہے۔ اگر اس ملک میں قانون نہ ہوتا تو کوئی ایک شخص بھی رات کو سونہ سکتا، مگر ہم سب سوتے ہیں، کیونکہ سب کو معلوم ہے کہ ابھی اتنی بھی اندھیر نگری نہیں مچی۔ قانون کمزور ہے، بے بس ہے مگر وہ ”ہے“۔ وہ ہے تب ہی تو اس سے گلہ ہے۔ اس ملک میں۔ فارس غازی۔ قانون۔ ہے۔ اور چاہے تم اسے مانویا نہ مانو۔ وہ قانون مجھ سے، تم سے، ہم سب سے اوپر ہے۔ اس لیے آئندہ میرے سامنے یہ کہنے کی ہمت نہ کرنا کہ اس ملک میں قانون نہیں ہے۔ سنا تم نے؟ سنا تم نے؟“

بے ربط سانسوں کے درمیان غصے اور برہمی سے

غراتے وہ کہہ رہی تھی اور وہ خاموشی سے اسے دیکھتا بن رہا تھا، جب زور کا چھٹکا ہوا۔ زمر نے جو کالج کی

نازک بولے حد سختی سے بھیج رکھی تھی وہ اس کے ہاتھ میں ٹوٹ گئی تھی۔ ”آہ“۔ وہ ایک دم پیچھے کو ہوئی۔ چھن چھن، ٹکڑے ٹکڑے نیچے گرے۔

وہ تیزی سے اس کی طرف لپکا اور اس کا ہاتھ پکڑا۔ کانچ اندر بھی لگا تھا اور خون بھل بھل گر رہا تھا۔ تیز تیز سانس لیتی زمر نے ناراضی سے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی، مگر اس نے دوسرے ہاتھ سے اس کی کلائی بھی پکڑ لی، پھر ایک خفا نظر زمر کے دہکتے گلابی چہرے پہ ڈال کر آہستہ سے کانچ نکالنے لگا۔ درد کی شدت سے اس نے آنکھیں بند کر لیں پھر فوراً ”کھول دیں کہ ان میں پانی در آیا تھا۔“

”یہی چاہتے تھے نا تم کہ میں تمہارے سامنے ٹوٹوں؟ روؤں؟“ آنسو اندر اتارتی وہ اسی برہمی سے بولی تو آواز بھیگی ہوئی تھی۔

فارس نے کانچ نکالتے چونک کر اسے دیکھا اور جیسے کچھ کہنے لگا تھا۔ جیسے انکار کرنے لگا تھا، مگر پھر خاموشی سے سر جھکائے کانچ نکالا۔ خون ایک دم تیزی سے بنے لگا تھا۔ ہتھیلی کے عین وسط میں کٹ لگا تھا۔ اس نے ادھر ادھر کسی چیز کی تلاش میں دیکھا، مگر کچھ بھی نہ تھا تو ایک ہاتھ سے اس کی کلائی پکڑے دوسرا ہاتھ ہتھیلی پہ رکھ کر دبایا۔ اس کے اپنے ہاتھ بھی خون آلود ہونے لگے۔ چند بوندیں نیچے بھی گری گئیں۔ دونوں اسی طرح چند لمحے کھڑے رہے پھر اس نے نظر اٹھا کر دیکھا وہ ان ہی گلہ آمیز نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”ایک طرف میرے زخموں پر مرہم لگاتے ہو، کہتے ہو کہ میں روڈ ’Bossy‘ غصہ ورا چھی لگتی ہوں، روتے ہوئے نہیں اور دوسری طرف کہتے ہو۔ مجھے گرا ہوا، ٹوٹا ہوا، رسوا اور ذلیل ہوا دیکھنا چاہتے ہو؟ ان میں سچ کون سا ہے؟“

وہ اسی طرح زخم پہ ہاتھ رکھے کھڑا تھا اور وہ پوچھ رہی تھی۔

”اگر وہ ریسٹورنٹ والی باتیں سچ تھیں تو پچھلی ہر

بات جھوٹ تھی، یہ بھی جھوٹ ہے۔“ اس نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا، مگر اس نے مزید مضبوطی سے پکڑ لیا۔

”اونہوں، ایک منٹ۔ خون رکنے دیں۔“

”پتا ہے کیا فارس!“ وہ اسی شاکی انداز میں بولی تھی۔ ”تم دو دلوں کے ساتھ جی رہے ہو۔ ایک میں زرتاشہ سے محبت نہ کرنے کا گلٹ (احساس ندامت) ہے، ایک میں مجھ سے بہت زیادہ محبت کر لینے کا گلٹ ہے۔ تمہارے یہ دونوں دل جھوٹ بولتے ہیں۔ زرتاشہ سے محبت تھی تمہیں، اور تمہاری سوچ سے زیادہ ہی تھی۔ یہ صرف گلٹ نہیں ہے جس کی وجہ سے لڑ رہے ہو اس کے لیے۔ اور رہی میں!“

اس نے بھیگی پلکیں بند کر کے آنسو اندر اتارے اور جب آنکھیں کھولیں تو وہ خشک تھیں۔

”تو مجھ سے تمہیں زرتاشہ سے کئی گنا زیادہ محبت ہے، مگر وہ اتنی اونچی اور عظیم نہیں ہے کہ تم اس میں ہر چیز معاف کرو۔ نہ وہ اتنی کمزور اور کھوکھلی ہے کہ تم اس میں مجھے گرا ہوا دیکھنے کی خواہش کرو۔ اللہ نے نہیں بنائے کسی آدمی کے سینے میں دو دل۔ تمہیں اپنے دل کو ایک جگہ ایک طرف رکھنا ہو گا اور خود سے سچ بولنا پڑے گا۔“

فارس چند لمحے اسے دیکھتا رہا، دیکھتا رہا۔ پھر چہرہ جھکائے اپنا ہاتھ ہٹا کر دیکھا، ہتھیلی کے کٹ سے بہتا خون رک چکا تھا۔ اسی طرح اس نے زمر کا ہاتھ اوپر کیا اور لبوں سے لگایا۔ آنکھیں بند کیے۔ چند لمحے چند سانسیں۔ پھر چھوڑ دیا۔ اور دو قدم پیچھے ہٹا۔ ”اپنا خیال رکھا کریں۔“

”یہ بھی جھوٹ ہے۔“ زمر نے دکھ سے اسے دیکھا اور اپنی چیزیں اٹھائے باہر نکل گئی۔

پھر اٹنے قدموں واپس آئی اور ادھ کھلا دروازہ زور سے دے مارنے کے انداز میں بند کیا۔ اس کی دھمک اب کتنی ہی دیر دونوں کے کانوں میں گونجتی تھی۔

وہ کہانیاں ادھوری، جو نہ ہو سکیں گی پوری انہیں میں بھی کیوں سناؤں، انہیں تم بھی کیوں سناؤ؟ اسپتال کے پرائیویٹ رومز کی رایداری میں سفید بٹیاں روشن تھیں۔ چمکتے فرش پہ ان ٹینوں کا عکس نظر آرہا تھا۔ سفید اور آل پنہ، موٹا چشمہ لگائے اور بال جوڑے میں پاندھے حنین ایک فرہی مائل نرس سے بات کر رہی تھی۔ تب ہی سیم نے اسے فکر مندی سے دیکھا۔

”حنہ! تم ویسے کر لوگی جیسے پھپھو نے کہا ہے۔“

”ہاں۔ مسئلہ ہی نہیں ہے۔“ حنہ نے شانے اچکائے، فولڈر سنبھالا، عینک ناک پہ پیچھے دھکیلی اور سیم کو وہیں چھوڑ کر نرس کے ساتھ آگے چلی گئی۔ اسپتال کی وبا اور شفا سے رچی بسی فضا میں لمحے خاموشی سے پھسلتے رہے۔ ایک کمرے میں بیڈ کی پائنٹی پہ بیٹھی حنین اب گلاسز اتارے سامنے نیم دراز سنہرے بالوں والی لڑکی کو دیکھ کر اسی اعتماد سے کہہ رہی تھی۔

”آپ ساری تفصیل سن چکی ہیں، شہزاد! میں ڈاکٹر نہیں ہوں، آپ سے ملنے کے لیے یہ کرنا پڑا کیونکہ باہر سیکورٹی بہت ہے۔ یہ میرے بھائی کے کیس کی تفصیلات ہیں۔“

اس نے فائل کھول کر شہزاد ملک کے سامنے کی۔ وہ پیچھے کو ہوئی، بالوں میں ہنر بینڈ لگائے، نقاہت زدہ مگر سپاٹ نظروں سے حنہ کو دیکھ رہی تھی۔

”وہ بھی اغوا ہوا تھا آپ کی طرح۔ آپ مل گئیں، وہ نہیں ملا۔ اس کو اغوا کرنے والا نیاز بیگ۔ میری قیامی کو اسے جیل میں رکھنے کے لیے آپ کے کیس کو وجہ بنانا پڑا۔ تب آپ کو ما میں تھیں۔ شکر ہے کہ اب آپ ٹھیک ہیں۔“ اس نے گہری سانس لی۔

شہزاد اب بھی خاموش تھی۔ نرس دروازے پہ بے چین سی کھڑی تھی۔

”ایک ہفتہ آپ کو ہوش میں آئے ہو گیا ہے، لیکن

آپ اپنے مجرموں کے بارے میں کوئی بیان نہیں دے رہیں۔ میں جانتی ہوں کہ آپ خوف زدہ ہیں۔ آپ بہت نارچر سے گزر رہی ہیں۔ ہم بھی گزر رہے ہیں۔ اسی لیے صرف اتنا چاہتے ہیں کہ اپنے مجرموں کا نام آپ لیں یا نہ لیں، لیکن اس شخص نیاز بیگ کو جیل سے نہ نکلنے دیں، تاکہ کل کو کوئی اور شہزاد یا سعدی کو نہ اغوا کیا جاسکے اور ہاں۔۔۔“ اس نے اضافہ کیا۔ ”آپ کو اپنے مجرموں کے خلاف کوئی مدد چاہیے ہو تو ہم آپ کے ساتھ ہیں۔“

گویا دیوار سے بولتے بولتے وہ چپ ہو گئی۔ اب مزید کیا کہے۔

”تمہیں پتا ہے دنیا میں کتنی آوازیں ہوتی ہیں؟“ وہ حنہ کے چہرے پہ نظریں جمائے، لہجے سے گویا ہوئی۔ حنین کے ابرو تعجب سے اکٹھے ہوئے۔ ”سوری“ میں۔۔۔

”ان گنت۔ دنیا میں ان گنت آوازیں ہوتی ہیں۔ جسم کے پتھر ملی زمین پہ گھسیٹنے کی آواز، کمر سے پتھر رگڑنے کی خراشوں کی آواز۔ سوکھے پتوں اور جھاڑیوں پہ کھینچے جانے کی آواز۔ بیچ جنگل کے آپ کو لاپٹخنے کی آواز۔ پھر گڑھا کھودنے کی۔ مٹی باہر پھینکنے کی آواز۔ بالوں سے کھینچ کر گڑھے میں ڈالنے کی آواز۔ ہاتھوں سے مٹی اوپر ڈالنے کی آواز۔ مٹی کے اوپر پتے ڈالنے کی۔ پھر سوکھے چرم پتوں پہ دور جاتے بھاری بوٹس کی آواز۔ پھر جنگل کی خاموشی کی آواز۔ زندہ قبر کے اوپر سانپ رینگنے کی آواز۔ پرندوں کے ایک دم سے درختوں سے اڑ جانے کی۔ جنگلی سوروں کی آواز۔ ان کے آپ کے اوپر پتوں کو سونگھتے پھرنے کی آواز۔ کتوں کی آواز۔ کیڑوں کے جسم پہ رینگنے کی آواز۔ خزیروں کی بدبودار سانسوں کی آواز۔ رات کی تاریکی کی ہولناک آواز۔ گدھوں کے اوپر منڈلانے کی آواز۔ پھر دور کہیں انسانوں کی آواز۔ خزیروں کے بھاگ جانے کی آواز۔ آتے قدموں کی آواز۔ تمہیں پتا ہے دنیا میں کتنی آوازیں ہوتی ہیں؟“

وہ پتھر لے چرے اور سرخ آنکھوں کے ساتھ کہہ رہی تھی اور حنین بالکل ساکت لب کھولے سن رہی تھی۔

”میں نے بہت سی آوازیں سنی ہیں اس جنگل میں نیم مرده حالت میں پڑے۔ میں اس لیے خاموش نہیں ہوں کہ میں خوف زدہ ہوں یا میرے ذہن پہ اثر ہو گیا ہے۔ مجھے تمہاری یا تمہارے بھائی کی مدد کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے، کیونکہ کوئی بھی حتیٰ کہ بھائی بھی اس قابل نہیں ہوتے کہ ان کے لیے کچھ کیا جائے۔ تم جاسکتی ہو۔“

ہکا بکا بیٹھی حنہ ایک دم اٹھی اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ بے ترتیب سانسوں اور سفید چہرے کے ساتھ وہ تیز تیز چلتی راہداری کا موڑ مڑی تو سیم انتظار کر رہا تھا۔ ”تم نے کر لیا حنہ؟“ وہ آگے چلتی گئی۔ سیم پیچھے لپکا۔ حنین نفی میں سر ہلاتی تیز تیز چلتی جا رہی تھی۔ سیم دیکھ سکتا تھا کہ وہ جس چہرے کے ساتھ گئی تھی اس کے ساتھ واپس نہیں لوٹی تھی۔



عداوت ہی عداوت ہے، محبت بھول بیٹھا ہوں چلو کوئی تو رشتہ ہے اسے پھر یاد کرنے کو زمر کے جانے کے بعد سے وہ لاک اپ میں قید تھا۔ دیوار کے ساتھ اکڑوں بیٹھے گہری سوچ میں گم۔ بار بار اس کی زرد رنگت نگاہوں میں گھومتی تھی۔ (تم مجھے ٹوٹا ہوا دیکھنا چاہتے ہو نا!) فارس نے سر جھٹکا۔

”ہاں“ میں ایسا ہی دیکھنا چاہتا ہوں آپ کو۔“ اس نے آنکھیں بند کیں۔ ذہن کے پردے پہ ایک منظر سا سوچنا چاہا۔ اس کی فرضی خواہش کا منظر۔ مگر پھر تکلیف سے آنکھیں کھول دیں۔

یہ تصور وہی تھا جو وہ چاہتا تھا پھر اس کو سوچ کر دکھ کیوں ہوتا تھا؟ خوشی تو زمر کے الزام اور ان تمام طنز و طعنے بھری باتوں سے بھی نہیں ہوتی تھی، اصولاً تو اس ٹوٹی پھوٹی شرمندہ لڑکی کو تصور میں دیکھ کر خوشی ہونا

چاہیے تھی، مگر نہیں ہوتی تھی۔ اسی لیے تو کی تھی اس سے شادی، وہ اس کو خود اذیتی کا شکار کرے گا، ضمیر کی ملامت سے گھیر لے گا، پھر یہ سوچ کر خوشی یا تسکین کیوں نہیں ملتی تھی؟ کیا وہ جہالت ہی تھیں جو وہ سوچتا تھا؟ یا جو وہ سوچتا تھا وہ صرف تو جہالت تھیں؟ حوالات کی سیاہ سلاخوں کے پار مدھم روشنی تھی۔ اس روشنی کو بے خیالی سے دیکھتے فارس غازی کا ذہن ایک دفعہ پھر پیچھے چلا گیا۔

ولایت بیگم کا گھر اس نے کیوں چھوڑا تھا؟ وہ کیوں ایک رات گھر سے نکلا تھا؟ وہ چاہتا بھی تو نہ بھلا سکتا تھا۔

لڑائی ہوئی تھی گھر میں۔ ہوتی پہلے بھی تھی، مگر اس رات کچن میں کسی بات پہ اونچا اونچا بولتے، جھگڑتے ولایت بیگم نے ہاتھ مار کر سالن کا ڈونگا گرایا تھا اور گرم گرم سالن سیدھا اس کی ماں کے پیروں پہ گرا تھا۔ سانحہ یہ نہیں تھا۔ سانحہ یہ تھا کہ اس کا باپ تب بھی کمزوروں کی طرح ولایت بیگم کو منانے اور ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ غصہ فارس کے اندر ابل ابل رہا تھا۔ وہ کمرے میں بیٹھی، پیر کے آبلوں پر مرہم لگاتی علیحدہ کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ وہ اب ادھر نہیں رہیں گے، وہ اس کے ساتھ واپس چلے، مگر علیحدہ اس کو صبر، تحمل اور برداشت کا درس دیتی رہی۔ وہ بھی ایک کمزور عورت تھی۔ ٹوٹی، پس پی ہوئی عورت جو کبھی ظلم کے خلاف نہیں کھڑی ہوگی۔

اس وقت اس کے نزدیک یہ سب ظلم ہی تھا اور اپنی ماں سے پہلی دفعہ وہ دل برداشتہ ہوا تھا۔ پیر میں جوتی تھی یا نہیں، وہ وہاں سے نکل بھاگا۔ طویل سرد سڑکوں پہ وہ چلتا رہا، چلتا رہا۔ کیسے قصر کا ردوار پہنچا، کچھ یاد نہیں۔ جواہرات نے اس کو اپنے گھر میں پناہ دی، پیروں پہ مرہم لگایا اور پھر اس کے ماں باپ کو بلا لیا۔ جانے کس نے طے کیا، مگر اس کے بعد علیحدہ ادھر ہی انیکسی میں رہنے لگی۔ وہ ماں سے خفا تھا۔ وقت کے ساتھ خفگی دھل گئی، مگر دل کا کائناساری زندگی نہیں نکلا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اسے بھی دل میں باتیں

رکھ کر نہ نکالنے کی بیماری ہے۔

”تمہیں کیسے پتا کہ میری نظر کمزور نہیں ہے؟“
”مجھے پتا ہے۔“ وہ چپ لیتے چھت کو دیکھتے بولا

تھا۔

”میں اس لیے لگتا ہوں کیونکہ مجھے عینک اچھی لگتی ہے۔“ کچھ دیر بعد اس نے خود ہی وضاحت دی۔
فارس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا، وہ کہنا چاہتا تھا کہ یہ تمہیں اچھی نہیں لگتی، اس سے تمہاری آنکھیں اندر کو دھکس جائیں گی، مگر اس نے وارث کا چہرہ دیکھا اور اس کا دل نہیں چاہا کہ وہ اس کی خوشی چھین لے۔

”ہاں، یہ تمہیں اچھی لگتی ہے۔“ اس دن کے بعد ان دونوں کے پاس ایک دوسرے سے کرنے کے لیے بہت سی باتیں ہوتی تھیں۔ وارث اس کا دوست بن گیا، وہ کبھی کبھی اس کو ڈانٹ بھی دیتا تھا، جب اسکول میں فارس کسی سے لڑ کر کسی کا دانت توڑ کر آتا، تو وارث غصے سے اس کو کالر سے پکڑ کر جھنجھوڑتا۔
”میں لڑتے رہو گے لوگوں سے تو جیل میں پڑے ہو گے کسی دن۔“

اور اب فارس سوچتا تھا کہ وہ جیل اس لیے گیا تھا کیونکہ اس دفعہ وارث لڑا تھا!

امی کی وفات کے بعد اس کا دل دنیا سے اُچاٹ ہو گیا تھا۔ وہ سارا سارا دن سڑکوں پہ آوارہ پھرتا رہتا تھا۔ بے مقصد، بے رونق زندگی کو ایک دم وہ صرف گزارنے لگا تھا۔ کبھی دوستوں کے ساتھ کسی طرف نکل گیا۔ تو کبھی اکیلا کسی ٹرین میں بیٹھ گیا۔ وارث لاہور میں تھا، ندرت اپنے گھر میں خوش اور ابو کو وفات پائے تو عرصہ بیت چکا تھا۔ فارس کی زندگی میں اکتاہٹ، بے گانگی برہ گئی تھی۔ اس کا دل پڑھائی میں نہیں لگتا تھا۔ کچھ دوستوں کے ساتھ وہ شکار پہ جانے لگا تھا۔ ماں باپ کا چھوڑا ہوا پیسہ وہ جھونکتا جارہا تھا۔ وہ گنز، وہ خوب صورت گنز جن کو ہاتھ میں پکڑ کر تاک کر کسی پرندے کی طرف نشانہ باندھنے کی کیفیت اور سرور ہی کچھ اور ہوتا تھا۔ وہ گنز اس کا جنون بنتی گئیں۔

ندرت اس کی حالت اور یہ آوارگی دیکھ کر اسے اپنے ساتھ لے آئیں۔ عام حالات میں وہ بہن کے گھر

ولایت بیگم کی وفات کے بعد ندرت اور وارث کو ابو انیکسی میں لے آئے۔ علیحدہ کارویہ ان کے ساتھ عجیب سا تھا۔ ولایت بیگم کے گھر میں وہ بے بس ہوتی تھی، یہاں وہ مالکن تھی۔ ظلم نہیں کرتی تھی، ہر شے مہیا کرتی تھی، ہر سہولت، ہر آسائش، مگر ان سے بات نہیں کرتی تھی۔

ندرت کے اپنے غم بہت تھے۔ شادی کے بعد شوہر سے ناراضی اور شیر خوار بچے کو سسرال والوں کے رحم و کرم پہ چھوڑ آنے کا غم، وہ بہت دکھی رہتی تھی۔ وارث خاموش رہتا تھا۔ جیسے نہ کسی سے محبت ہو، نہ کسی سے گلہ۔ پھر آہستہ آہستہ وقت بدلا۔ ندرت اس کے کام کرنے لگی۔ اس کا خیال رکھنے لگی۔ وہ چھوٹا تھا، وارث سے بھی کافی چھوٹا، ندرت کو اس میں سعدی نظر آنے لگا تھا۔ وہ کبھی کبھی بے خیالی میں اسے سعدی بھی پکار لیتی، وہ برامانے بغیر چپ چاپ آجاتا تھا۔ اس کی تصحیح نہیں کرتا تھا۔

وارث عینک لگاتا تھا۔ بڑھتے وقت بھی ٹی وی دیکھتے وقت بھی۔ سرما کی ایک شام وہ انیکسی کے لاؤنج میں بیٹھے تھے، جب ابو نے وارث سے کوئی شے ڈھونڈنے کو کہا، تو وہ جو بغیر عینک کے بیٹھا تھا، ساوگی سے بولا کہ اس کی عینک ٹوٹ گئی ہے، وہ نہیں ڈھونڈ سکتا۔
ابو نے وہی کام فارس سے کہہ دیا۔ فارس خاموشی سے اٹھا اور اندر گیا۔ واپس آیا تو ہاتھ میں وارث کی عینک تھی، جس کے شیشے نکلے ہوئے تھے۔ عینک اس نے وارث کے سامنے رکھی۔

”اس کے شیشے ہوتے، تب بھی وہ زیرو نمبر کے تھے۔ ان سے تمہاری نظر پہ کوئی فرق نہ پڑتا۔ جاؤ اور جو ابو نے کہا ہے، وہ ڈھونڈ کر لاؤ۔“

اس نے یہ الفاظ بہت آہستہ سے کہے تھے، ٹی وی کا شور تھا اور ابو دور تھے، سن نہ سکے۔ وارث کا رنگ سفید پڑا۔ اس کی چوری پکڑی گئی تھی۔ اس وقت تو وہ چپ چاپ اٹھ گیا، لیکن رات کو اس کے ساتھ والے سنگل بڈیہ لیٹے اس نے پوچھا تھا۔

جا کر نہ رہتا، مگر اپنے گھر میں ذہن ایسا پرانگندہ رہتا تھا کہ وحشت ہونے لگتی۔ چند تب تین سال کی تھی۔ سعدی اسکول جاتا تھا، ایک وہی ہوتی تھی جو دن رات اس کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتی تھی۔ اتنا بولتی کہ الامان۔ یہ کیوں ہے؟ یہ کیا ہے؟ وہ کبھی زچ ہو جاتا، کبھی ہنس دیتا۔ زندگی ان ہی دو انتہاؤں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔

وہ پڑھائی میں ہر گزرتے دن کے ساتھ نکما ہوتا جا رہا تھا۔ دور کے شہروں، جنگل، بیا بانوں میں جانا، کئی کئی دن گھر نہ لوٹنا، عجیب تھی اس کی زندگی بھی۔ وارث فون پہ غصہ کرتا رہتا، وہ فون بند کر دیتا۔ ندرت پیار سے سمجھاتیں، وہ دوسرے کان سے نکال دیتا۔ پھر ایک دن ندرت کے سر آئے۔ پتا نہیں ندرت نے ان سے کیا کہا تھا کہ جب وہ ان کے پاس اکیلا، چپ اور بیزار سا بیٹھا تھا تو وہ اس سے باتوں باتوں میں پوچھنے لگے۔

”تم کیا کرو گے آگے؟ کیریئر کے حوالے سے؟“
”جس چیز کا موڈ بنا۔“ اسے لگا ابھی لیکچر شروع ہو گا۔
سو مزید آگیا۔

”تمہاری زندگی میں ترجیحات کیا ہیں؟“
”کیا؟“ وہ واقعی الجھا تھا۔
”تمہاری ترجیحات؟ کس کو سب سے اوپر رکھتے ہو؟ کس کے لیے سب کچھ کر سکتے ہو؟“
فارس لمحے بھر کو چپ ہوا۔ ”اپنے خاندان کے لیے۔“

”وہ تو ابھی ہے نہیں۔“
”ہے تو سہی۔“

”خاندان بیوی اور بچوں کا نام ہوتا ہے۔ میں جو اتنے استحقاق سے اس گھر میں آتا ہوں اس لیے کہ یہ میرے بیٹے کا گھر ہے۔ کیا میں اپنے بھائی یا بہن کے گھر اتنے استحقاق سے جاسکتا ہوں؟ حکم چلا سکتا ہوں؟ نہیں۔ وہ بھی میرا خاندان ہیں، لیکن اس عمر میں اگر بیوی بچے سب سے پہلے آتے ہیں۔ تم کیا چاہتے ہو زندگی میں؟“

وہ متذبذب رہا۔ زیادہ بات نہیں کر سکا، مگر چند دن وہ سوچتا رہا۔ پھر ایک دن وہ ان کے گھر گیا۔ معلوم ہوا تھا کہ ان کی بیٹی کا جینز جل گیا ہے، بہت نقصان ہوا ہے۔ وہ افسوس کے لیے گیا تھا، مگر ان کے پاس بیٹھے، اس نے ان سے کہا تھا۔

”میری ترجیحات ایک ساہ زندگی کی ہیں۔ میری بیوی، میرے بچے، ایک چھوٹا سا گھر، جس میں کوئی پیچیدگیاں نہ ہوں۔ کوئی سازشیں، کوئی منافقت، کوئی دوسری بیوی کے جھگڑے نہ ہوں۔ ایک ساہ زندگی گزاروں میں۔ ٹائن ٹوفائیو کی جاب اور گھر کا سکون۔ یہی چاہتا ہوں میں۔“

”پھر محنت کرو۔ اپنی بیوی اور بچوں کا سوچ کر محنت کرو کہ تم ان کو کیا دے سکتے ہو۔“
اور اس گفتگو نے فارس کی سوچ بدل دی تھی۔ وہ جیسے کسی لمبے خواب سے جاگتا تھا۔

آنے والے سالوں میں خود پر خواہ مخواہ کے چڑھے قرضے، پڑھائی کی تکمیل، نوکری، ہر فرض کی ادائیگی میں ندرت کے سسر نے اس کی مدد کی تھی۔ ان سے اس کا کوئی رشتہ نہ تھا (سوائے دو پار کی رشتے داری کے) مگر احسانات بڑھتے جا رہے تھے۔ وہ ان کا بہت احترام کرتا تھا۔ ان کی بات جیسے سنتا کسی اور کی نہیں سنتا تھا۔ وہ نوکری میں اچھا جا رہا تھا، ساہ زندگی ساہ ہی چل رہی تھی، لیکن پھر اسے اندرون سندھ بھیج دیا گیا۔ وارث اگلے ماہ اس سے ملنے آیا تو سخت برہم تھا۔

”تم نے مجھ سے کہا کہ تمہاری سندھ میں پوسٹنگ ہوئی ہے!“

”اور نہیں تو کیا؟“
”تم نے یہ نہیں بتایا کہ تمہیں یہاں سزا کے طور پر بھیجا گیا ہے۔“ وہ بے حد تنگ پا ہو رہا تھا۔ فارس نے ناک سے مکھی اڑائی۔

”میں نے کچھ غلط نہیں کیا تھا۔“

”یہی بات تم نے کہی تھی اپنے ڈائریکٹر سے۔ فارس! تم نے غلط کیا ہے۔ اس بینک آفیسر کے آرٹس وارنٹ نکل رہے تھے اور تم نے اسے اطلاع دے دی

تھا۔ اسے جیل میں سب سے زیادہ وارث یاد آیا تھا۔



ہو نہ سکا کبھی ہمیں اپنا خیال تک نصیب
نقش کسی خیال کا لوح خیال پر رہا
اس مصروف شاہراہ پر رات نو بجے اچھی خاصی
سردی ہونے کے باوجود گہما گہمی تھی۔ ایسے میں زمر
کندھے پہ لگا پرس مضبوطی سے پکڑے، متلاشی
نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی چلی رہی تھی۔ پھر اسے وہ
نظر آئی گیا۔ تیزی سے اس تک آئی۔

”احمر! مجھے دیر ہو گئی نا؟“ وہ معذرت خواہانہ انداز
میں جلدی جلدی کہتی قریب آئی۔ ”کیا وہ لڑکا آگیا؟“
احمر چونک کر مڑا پھر فخر سے سر کو خم دیا۔

”جی“ اور کام بھی ہونے والا ہے۔“ مسکرا کر سامنے
اشارہ کیا۔ زمر نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں
دیکھا۔ وہاں ایک خوبصورت جوان اپنے سامان کی ٹرائی لپے
کھڑا تھا اور قدرے حیرت اور تعجب سے سیکورٹی
افسران سے بات کر رہا تھا جو ایک دم سے اس کو گھیر کر
اس سے باز پرس کرنے لگے تھے۔ وہ صرف پولیس
اہلکار نہیں تھے بلکہ کسی دوسرے محکمے کے افسران بھی
تھے۔

”وہ چیزیں اس کی کار میں ڈلوادی تھیں نا احمر؟“
پولیس اس کو اریسٹ کر لے گی؟“ وہ فکر مندی سے
بولی تھی۔

”جی جب یہ گیس بھروانے پمپ پر رکھا تو میرے
لڑکے نے ایک بیگ اس کی گاڑی کی ڈگی میں رکھ دیا
تھا۔ بیگ میں اس لڑکے کے آئی ڈی کارڈ کی کاپی اور
ڈرائیونگ لائسنس کی کاپی بھی ہے۔ وہ انکار بھی کرے
تب بھی وہ لوگ اس بیگ کو اسی کی ملکیت سمجھیں
گے۔“

”لوکے تھینک یو۔“ ہر چیز پلان کے مطابق
جاری تھی اسے ذرا سکون ملا۔ ”کالی ساری ڈرگز ڈالی
ہیں نا؟“

”ڈرگز؟“ احمر نے نگاہوں کا رخ موڑا۔ ”کون سی

ناکہ وہ ضمانت قبل از گرفتاری کروالے!“

”پہلی بات میں نے کوئی ثبوت چھوڑا نہیں،
دوسری بات وہ بینک آفیسر تین چھوٹی چھوٹی بیٹیوں کی
ماں ہے اور بے گناہ ہے۔“

”تو وہ اس کے ٹرائل میں ثابت ہو جائے گا کہ وہ
بے گناہ ہے۔ تمہیں بیچ میں پڑنے کی کیا ضرورت
تھی؟“

”وارث! وہ ایک جوان، ٹل کلاس عورت ہے، اگر
وہ بے گناہ نہ ہوتی تب بھی میں اس کو خبردار کرتا،
ضمانت اس کی چوبیس گھنٹوں میں ہو ہی جاتی، لیکن اگر
وہ ایک رات بھی حوالات میں گزار لیتی تو وارث اس کی
زندگی برباد ہو جاتی۔ مرد کئی سال بھی جیل میں رہے تو
کچھ نہیں ہوتا، عورت کو کون قبول کرے گا بعد میں؟
ہاں ٹھیک ہے میں نے جرم کیا ہے۔“ وہ بھی برہمی
سے بول رہا تھا۔ ”لیکن مجھے دس بار ایسا موقع ملے میں
تب بھی یہی کروں گا۔ کیونکہ میں اسی معاشرے میں
رہتا ہوں جہاں جیل میں ایک رات بھی رہی عورت
کی بیٹیوں کی شادیاں نہیں ہو پاتیں۔ میرا ضمیر مطمئن
ہے، کیونکہ جو قانون روٹی نہیں دے سکتا، وہ ہاتھ نہیں
کاٹ سکتا۔ بھلے اس کی پاداش میں مجھے کتنے ہی سال
اس چھوٹے شہر میں پوسٹر رہنا پڑے۔“

”فارس!“ وہ تھک کر ساتھ بیٹھا اور سمجھانے لگا۔
”دیکھو“ ”صحیح“ کام کرنے کے لیے قانون توڑنا ضروری
نہیں ہے۔ میں بانی دی بک کام کرنے والا آدمی ہوں،
مجھے تمہارا یہ وہجیلاٹ رویہ ڈراتا ہے۔ اگر ان کو
کوئی ثبوت مل جاتا تو تم جیل بھی جاسکتے تھے اور اگر
تمہاری یہی حرکتیں رہیں نا تو میں اگلے پانچ سال بعد
تمہیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے دیکھ رہا ہوں۔“
سمجھاتے سمجھاتے وہ خفا ہو گیا تھا۔

”اور پتا ہے میں تمہیں اگلے پانچ سال بعد کہاں
دیکھ رہا ہوں؟“ وہ آگے ہو کر سنجیدگی سے وارث کی
آنکھوں میں جھانک کر بولا تھا۔ ”اسی نعلی عینک کے
پیچھے!“ اور ایک دم وہ دونوں ہنس پڑے تھے۔

آہنی سلاخوں کو دیکھتے ہوئے وہ زخمی سا مسکرایا

ڈرگز؟

زمر کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ ”احمر! اس کے بیگ میں ڈرگز ڈالنے کو کہا تھا میں نے آپ کو تاکہ پولیس اسے گرفتار کرے۔“

”میں آپ کو شکل سے کوئی ہیروئن اسمگلر لگتا ہوں یا بذات خود کوئی نشنی لگتا ہوں جو میرے پاس ڈرگز ہوں گی؟ نہیں“ آج آپ مجھے بتا ہی دیں کہ میں آپ کو کیا لگتا ہوں۔“ وہ بہت ہی خفا ہوا تھا۔ زمر کا دماغ ویسے ہی آج کل گھوم رہا تھا اب تو مزید کھول گیا۔

”احمر! آپ نے کیا ڈالا ہے اس کے بیگ میں؟“ پریشانی سے ان لوگوں کو بھی دیکھا۔ آفیسرز کے پاس کتے بھی تھے اور وہ گھوم گھوم کر اس کے سامان کو سونگھ رہے تھے لڑکا ابھی تک بحث کر رہا تھا۔

”دیکھیں یہ ڈرگز یہ اسلحہ یہ کرنسی اسمگلنگ۔۔۔ یہ میوزیم کے نوادرات سارے انگریزی فلموں والے گھسے پٹے آئیڈیاز تھے۔ میں نابڑا اور بجنل بندہ ہوں۔ میں نے سوچا کوئی پاکستانی چیز ٹرائی کروں۔ وہ دیکھیں۔“ فخر سے مسکرا کر اس طرف اشارہ کیا۔ زمر پریشانی سے ادھر دیکھنے لگی۔ وہ لوگ اب باری باری لڑکے کے ہنگز چیک کر رہے تھے۔ قلی نو دو گیارہ ہو چکا تھا۔ ایک آفیسر نے بھورا بیگ کھولا اور پھر گویا شور مچا دیا۔ باقی اہلکار بھی ادھر ہی لپکے۔ لڑکا حیران پریشان وضاحتیں دے رہا تھا۔ زمر نے اڑیاں اونچی کر کے دیکھنا چاہا۔ بمشکل ایک افسر سامنے سے ہٹا تو کھلے بیگ کا دہانہ نظر آیا۔ اور اس کے اندر۔۔۔

”کچھوے!“ وہ بے یقینی سے احمر کی طرف گھومی تھی۔ ”استغفر اللہ احمر! آپ نے کچھوے ڈال دیے؟“ دل چاہا اس کو زمین میں گاڑ دے۔

”پورے پچاس کچھوے۔“ اس نے اسی تقاخر سے اس طرف اشارہ کیا۔ دور سے اتنا پتا چلتا تھا کہ اس بیگ میں چھوٹے چھوٹے شاہی کباب کے سائز کے کچھوے چل رہے تھے۔ زمر نے ماتھے کو چھوا۔

”اف احمر۔۔۔ آپ کو مذاق لگتا ہے یہ سب؟“ ”دیکھیں مسز مرزا! وہ سنجیدہ ہوا۔ ”اگر ڈرگز ڈالتا

اسلحہ تو وہ گرفتار ہو جاتا، لیکن صبح سے پہلے تک باہر ہوتا۔ سوائے وائلڈ لائف والوں کے کوئی بھی محکمہ اس کو کل دوپہر سے پہلے تک نہ رکھتا۔“

”کچھوے احمر!“ وہ اب بھی شدید تالاں تھی۔ یہ وائلڈ لائف والوں کے خاص spotted کچھوے ہیں۔ صبح ہی چوری ہوئے ہیں۔“ مسکرا کر آنکھ دبائی ”یہ لڑکا کل سنگاپور جا رہا ہے۔ سنگاپور میں ایک کچھو ا کئی ہزار کا بکتا ہے۔ وہ لوگ کچھوے کھانے کے شوقین ہیں، مگر وہاں پابندی ہے اس کے شکار پہ کیونکہ اس معصوم کی نسل ناپید ہوتی جا رہی ہے۔ سو ہمارے ہاں سے لوگ اسمگل کرتے ہیں۔ لی پاکستان۔ بانی پاکستان۔“

زمر نے صرف گھور کر اسے دیکھا اور سامنے دیکھنے لگی جہاں کشم اور وائلڈ لائف کے اہلکار اس لڑکے کو ہتھکڑی لگا رہے تھے اور وہ مسلسل چلا رہا تھا۔ زمر کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑنے لگے۔ آئیڈیا کچھ اتنا برا بھی نہ تھا، لیکن احمر شفیق کو شکریہ کہنا۔۔۔ ناممکن! وہ گھر آئی تو حنین اس کے کمرے میں چت لیٹی، چھت کو دیکھتی مایوس نظر آرہی تھی۔ بیگ اور موبائل رکھتے ہوئے اس نے حنہ کو مخاطب کیا۔ ”شہزاد کا کیا بنا؟“

”میں نہیں کر سکی۔“ وہ شرمندہ تھی۔ ”اوکے! میں خود اس سے بات کر لوں گی۔“ حنین سیدھی اٹھ بیٹھی، بے چینی سے اسے دیکھا۔ ”وہ تکلیف میں ہے اس کو اکیلا چھوڑ دیں۔“

”حنین! اس کی صحت اب بہت بہتر ہے اور ہم اس کی مدد بھی کریں گے اس کے مجرموں کو پکڑنے کے لیے۔“ وہ بالوں میں برش کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ہاتھ پہ پٹی بندھی تھی۔ حنہ کو نہیں نظر آئی۔ وہ کہیں اور تھی۔

”وہ اب بھی وہی آوازیں سنتی ہے۔ جنگل کی جانوروں کی خنزیروں کی اور۔۔۔“

حنین ایک دم ساکت ہوئی۔ چونک کر زمر کو دیکھا۔ پھر کا ایک بستر سے اتری اور ننگے پیر بھاگتی باہر نکل گئی۔

زمر سر جھٹک کر رہ گئی۔ حیدر اب تیز تیز زینے پھاٹتی تہہ خانے کی طرف جارہی تھی۔ اسے ابھی ابھی کچھ یاد آیا تھا۔



بے وفائی کی گھڑی، ترک مدارات کا وقت اس گھڑی اپنے سوا نہ یاد آئے گا کوئی عالیشان، بلند و بالا سا بنگلہ تھا جس میں صبح کی ٹھنڈ اور سرما کی دھوپ مل جل کر آٹھری تھیں۔ ملازم حنین کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چلے گئے تھے۔ وہ شنزرا کی دوست تھی اس نے یہی کہا تھا۔ اس روز کے برعکس وہ کھلے بالوں پہ ہینر بینڈ لگائے ہاتھ میں فائل فولڈر پکڑے، ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھی کافی پُر اعتماد نظر آرہی تھی۔ کھڑکی سے باہر لان میں منتظر بیٹھا اسامہ نظر آ رہا تھا۔

چوکھٹ پہ شنزرا کھڑی دکھائی دی تو حنین جگہ سے اٹھی۔

”میں نے کہا تھا مجھے تمہاری مدد نہیں کرنی۔“ وہ بے نیازی سے پلٹنے لگی تھی۔

”تم نے کہا تھا تمہیں بھاری بوٹس کی دھمک سنائی دی تھی تم نے کہا تھا کوئی بھائی اس قابل نہیں ہوتا کہ اس کے لیے کچھ کیا جائے۔“ شنزرا چونک کر اس کی طرف گھومی۔ حیدر فولڈر سے کانڈ نکال کر اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

”تمہارا تو کوئی بھائی نہیں ہے شنزرا! مگر تم عادتاً اپنے بہنوئی سرد شاہ کو بھائی کہہ کر پکارتی ہوتا۔“ کانڈ اس کے چہرے کے آگے لہرایا۔ شنزرا کے ان پاکس میں سرد کی مہلذ کے پرنٹ آؤٹ۔ شنزرا کی رنگت سفید پڑی۔ ”اس نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ تمہاری بہن کو چھوڑ دے گا تمہیں اپنا لے گا اور جس دن تم اغوا ہو میں اس روز اسی نے آنا تھا تمہیں پک کرنے۔ اسی نے کیا ہے یہ سب! مگر کتنا بڑا اداکار ہے وہ۔ جب میری فیملی نے نیاز بیگ کو اس کیس میں پھنسانا چاہا تو اس نے ایسی اچھی اداکاری کی کہ ہم سب

بھی کنوینس ہو گئے کہ وہ اپنی ”بہن“ کا مجرم نیاز بیگ کو ہی سمجھ رہا ہے۔“

شنزرا اسٹک کے سہارے چلتی چپ چاپ سامنے آکر بیٹھی۔ بیگلی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”میں کسی کو نہیں بتا سکتی کیونکہ سب کو میں قصور وار لگوں گی۔ کوئی نہیں مانے گا کہ میرا اس سے تعلق صرف پسندیدگی کا تھا۔“ وہ ایک دم شکست خوردہ لگنے لگی تھی۔ کچھ دیر لگی اسے کھلنے میں۔

”میں یہ تعلق ختم کرنا چاہتی تھی میں چھپ چھپ کر فون پہ بات کرنے والے گلٹ سے تنگ آگئی تھی اسی لیے اس نے بلایا تو میں ملنے چلی گئی۔ مجھے نہیں بتا تھا وہ یہ سب۔“ آواز رندھ گئی۔ ”تم نہیں سمجھ سکتیں میں کیا محسوس کر رہی ہوں!“

حنین اس کے سامنے دھیرے سے بیٹھی۔ ”میں سمجھ سکتی ہوں شنزرا۔ تم نے ایک غلط آدمی سے محبت کی جو تمہارا رشتہ دار تھا تم سے عمر میں بڑا تھا تم اسے بھائی کہتی تھیں۔ اور اس نے۔ اس نے تمہاری حوصلہ افزائی کی۔“ اس کے اندر بہت کچھ اٹکا۔ ”اس کے لیے تو یہ محض وقت گزاری تھی۔ تمہارے لیے یہ روگ تھا۔ تم بیک وقت اس سے بات کرنے سے خوش بھی ہوتی تھیں اور گلٹی بھی۔ تم دو دلوں کے ساتھ جی رہی تھی۔ پھر ایک دن اس نے تمہیں بلایا۔ تم چلی گئیں۔“ بہت کچھ یاد آیا تھا۔ ”تمہیں نہیں بتا تھا کہ وہ ایک کرمنڈل بھی ہے تم جانتیں نہ جانتیں تمہیں کبھی نہ کبھی پتا چل ہی جاتا۔ اور تب بھی تم دو حصوں میں بٹ جاتیں جیسے اب بٹی ہوئی ہو۔ تمہارا ایک دل اس سے شدید محبت کرتا ہے دوسرا دل اس سے نفرت کرتا ہے۔ ایک طرف تم اس سے انتقام لینا چاہتی ہو مگر انتقام خوشی نہیں دیتا۔ دوسری طرف تم اب بھی اس سب کے بعد بھی دور اندر اس کو پانا چاہتی ہو مگر اب خوشی پانے سے بھی نہیں ملے گی۔“

”پھر میں کیا کروں؟“

”تم ساری آوازیں بھول جاؤ اور اپنی آواز اٹھاؤ تمہاری آواز کے پس منظر میں ہر شے غائب ہو جائے

دھمک۔ ایسے میں ایک راہداری کے باہر وہی لڑکا جو گزشتہ رات چوری کیے مسروقہ کچھوؤں کے ساتھ پکڑا گیا تھا، وہ ہتھکڑیوں میں کھڑا تھا، ساتھ پولیس اہلکار موجود تھے۔ چند وکلاء اور ایک سوٹ میں ملبوس صاحب جو چہرے مہرے سے اس لڑکے کے والد لگتے تھے، آپس میں بحث کر رہے تھے۔

”میں کراچی میں نہ ہونا تو دیکھتا، میرا بیٹا کس طرح حوالات میں رات گزارتا ہے۔“ والد پر ہی سے کہہ رہا تھا۔ پھر گھڑی دیکھی۔ ”کتنی دیر مزید لگے گی؟“ وکیل جواب میں جلدی جلدی کچھ بتانے لگا۔ تب ہی دور راہداری سے زمر چلتی آتی دکھائی دی۔ بال جوڑے کی شکل میں، چہرے پہ مسکراہٹ اور چال میں اعتماد۔ ان صاحب کے پاس وہ رکی۔

”کیا میں آپ سے علیحدگی میں بات کر سکتی ہوں؟“ شائستگی سے ان کو مخاطب کیا۔ لڑکے کا والد چونک کر مڑا اسے دیکھا، پھر ساتھ چلا آیا۔

”کشم کے یہ آفیسر آپ سے ملنا چاہتے ہیں، مگر علیحدگی میں، انہوں نے یقین دلایا ہے کہ آپ کے بیٹے کا ریکارڈ بھی کلیئر رہے گا۔ ان کو معلوم ہے کہ وہ سی ایس ایس کی تیاری کر رہا ہے۔“ مسکرا کر ایک کارڈ اس کی طرف بڑھایا، پھر اس کی پیشانی کو دیکھا جہاں ہلکا ہلکا پسینہ تھا، مگر خود بھی اس پسینے سے بے خبر اس آدمی نے کارڈ لیا اور پھر اثبات میں سر ہلایا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اس کے ساتھ چلتی اس کو مختلف راہداریوں سے گزارتی چلتی جا رہی تھی۔ ساتھ ہی بار بار گھڑی بھی دیکھتی۔ کن اکھیوں سے اس نے دیکھا کہ وہ شخص ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کر رہا تھا۔ جیسے اسے ٹھٹھن ہو رہی ہو۔

زمر ایک دروازے کے سامنے رکی۔ وہاں دو پولیس اہلکار کھڑے تھے۔ ایک نے دروازہ کھول دیا۔

”آپ اندر چلے جائیں، الیاس فاطمی صاحب!“ وہ مسکرا کر بولی تو اس نے اندر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ وہ خالی کورٹ روم تھا۔ الیاس فاطمی دو قدم اندر گیا ہی تھا کہ زمر نے دروازہ بند کیا اور بولٹ چڑھا کر لاک کلک

گی۔“ نہیں کر سکتی! وہ سارا الزام مجھ پہ ڈال دے گا۔ بابا اور عائرہ مجھے کبھی معاف نہیں کریں گے۔“ بے بسی سے اس کی آواز بلند ہوئی۔

”کتنے لوگوں کو پتا ہے کہ تم اس سے یوں میسجوز پہ بات کرتی تھیں؟“

”صرف مجھے اور سرمد کو!“ آواز کپکپائی۔ آنکھوں میں بیک وقت دونوں جذبے ابھرے۔

”تو پھر تم یہ والی بات چھپالو۔“ شہزاد چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

”تو میں کیا کہوں گی؟ کیوں ملنے گئی تھی سرمد سے؟“

اور میری کسی جھوٹی وجہ پہ بابا کیسے یقین کریں گے؟“

”اس پہ کر لیں گے!“ مسکرا کر اس نے ایک پھولا ہوا پیکٹ شہزاد کی طرف بڑھایا تھا۔ ”تمہیں سرمد شاہ کی الماری سے یہ ملا تھا۔ تم اسی کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھیں اور اس نے جو بھی کیا تمہیں خاموش کرانے کے لیے کیا۔“ شہزاد حیرت سے اسے دیکھتی پیکٹ کھولنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ لان میں آئی تو سیم نے بے اختیار پوچھا تھا۔

”کیا تم نے کر لیا پھپھو کا کام؟“

”ہاں کر لیا!“ اس نے مزے سے سیم کی کہنی میں بازو ڈالا اور آگے چلنے لگی۔

”ویسے یہ سب تھا کیا؟“ وہ متحس ہوا۔ حند نے اسے گھورا۔

”چپ کر کے چلو۔ زیادہ جہان سکندر بننے کی ضرورت نہیں ہے۔“ سیم نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا، مگر چپ رہا۔

Downloaded From pak society.com

خزاں کے پھول کی مانند بکھر گیا کوئی تجھے خبر نہ ہوئی اور مر گیا کوئی کورٹ کی راہداریوں میں ہنوز ویسا ہی رش تھا۔ بھانت بھانت کی بولیاں اور آتے جاتے قدموں کی

READING
Section

سے بند کیا، پھر چابی نکال کر پولیس اہلکار کی مٹھی میں دبائی۔

”اگر وہ مقررہ وقت سے پہلے باہر نکلا تو تمہارے آدھے پیسے کاٹ لوں گی۔“ گھور کر تنبیہ کی۔ سپاہی نے سینے پہ ہاتھ رکھا۔

”آپ فکر ہی نہ کریں میڈم صاحبہ۔“ زمر سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔ (آئی ایم سوری اللہ تعالیٰ ان تمام قوانین کے لیے جو آج میں نے توڑے! اور فارس اور احمد جیسے کرمینلز کے ساتھ کام کرنے کے لیے!) جھڑپ جھری لے کر وہ پڑ پڑاتی جا رہی تھی۔ کوئی عادت سی تھی جو واپس آرہی تھی۔

خالی کورٹ روم میں آگے چلتے ایک دم الیاس فاطمی مڑا۔ اسے دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ چونک کر وہ دروازے تک آیا اور اسے کھولنے کو ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ۔

”اپنی توانائی بچا کر رکھو۔ دروازہ لاکڈ ہے“ اسے توڑنے میں پندرہ منٹ لگیں گے جبکہ تمہارے پاس صرف بارہ منٹ ہیں۔“ آواز پہ وہ ایک دم گھوما۔

جج کے خالی چیمبر کا دروازہ کھول کر وہ باہر نکل رہا تھا۔ کورٹ روم کی کوئی جی نہیں جلی تھی۔ دن کی روشنی کافی تھی، پھر بھی جج کا چہرہ اندھیرے میں لگ رہا تھا۔ الیاس فاطمی نے آنکھیں سکیڑ کر تعجب سے دیکھنا چاہا۔ نیلی جینز کے اوپر اس نے بھورا سویٹر پہن رکھا تھا۔ پوری آستین والا سویٹر۔ چھوٹے کٹے بال اور بڑھی شیو۔ سنہری آنکھوں میں چھین لیے وہ جج کی کرسی کے پیچھے آکھڑا ہوا اور کرسی کی پشت پہ اپنے دونوں ہاتھ رکھے، ہتھکڑی میں بندھے ہاتھ۔

”ڈرو نہیں۔ میں ہتھکڑی میں ہوں۔ قید میں ہوں۔ پہچانا تم نے مجھے؟ میں فارس غازی ہوں۔ وارث غازی کا بھائی!“ الیاس فاطمی کی گردن کے بال تک کھڑے ہو گئے۔ لب کھل گئے۔ آنکھوں میں شاک ابھرا۔ پھر ایک دم وہ گھوما۔

”کچھری میں جنم کی طرح کا شور ہے، دروازہ پٹینے کی

آواز سن بھی لی جائے تو فائدہ نہیں۔ تمہارے پاس صرف گیارہ منٹ ہیں، کیونکہ تمہاری طبیعت خراب ہونا شروع ہو چکی ہے۔“ فاطمی نے دروازے پہ ایک دفعہ ہی ہاتھ مارا تھا کہ اس کا آخری فقرہ سن کر چونکا، پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ اسی سکون سے کرسی کے اوپر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔

”تمہارے سر میں درد ہو رہا ہے نا؟ ہر گزرتے پل کے ساتھ یہ تیز ہو جائے گا۔ کیونکہ جو چائے تم نے پراسیکیوٹر کے آفس میں پی تھی وہ چائے نہیں تھی۔“ فاطمی نے بے اختیار اپنی پیشانی کو چھوا۔ وہ ٹھنڈی پڑ رہی تھی۔ اس نے دوسرا ہاتھ گلے پہ رکھا۔ وہ گھٹ رہا تھا۔ آنکھیں وحشت سے پھیلیں۔

”کیا۔ کیا مطلب؟“ وہ مڑ کر پھر سے دروازہ بجانے لگا، مگر ہاتھوں سے جان نکل رہی تھی۔

”ویل سے شادی کرنے کا ایک فائدہ ہوتا ہے۔

آپ کورٹ کا ہر ملازم خرید سکتے ہیں۔ اس ملازم نے زیادہ کچھ نہیں ملایا۔ صرف ایک چھوٹی شیشی تھی۔ زہر کی۔“ ہلکا سا مسکرایا۔ ”میرا ایک دوست ہے

لاہور کے مضافات میں اس کا اپنا فارم ہاؤس ہے اور لیب بھی۔ وہاں ایسے وائرس اور زہریلے محلول کچھر کے جاتے ہیں۔ ابھی تو تمہارا دم گھٹ رہا ہے، لیکن اگلے آٹھ منٹ میں سانس بھی رکنے لگے گا، پھر ناک اور کانوں سے خون آئے گا، پھر دل کی دھڑکن بے قابو ہوگی۔“ وہ کہتے ہوئے چلتا ہوا کرسی کے پیچھے سے نکلا۔

”پھر سینے میں شدید درد اٹھے گا۔“ وہ چہوڑے کے دہانے پہ آکھڑا ہوا اور نیچے وہیں بیٹھ گیا۔ ”اور گیارہویں منٹ تمہارے دماغ کی شریان پھٹ جائے گی اگر۔“ بند مٹھی کھول کر دکھائی۔ اس میں شفاف شیشی تھی جس میں شفاف محلول تھا۔ ”اگر تم نے اس زہر کا antidote (تریق) نہ لیا۔“ الیاس فاطمی نے قدم بڑھائے، مگر لڑکھڑا کر زمین پہ گر اور بے اختیار دیوار کا سہارا لیا۔ پھر سفید چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

”تم جھوٹ بول رہے ہو!“ اس کا سانس رکنے لگا تھا۔

”نھیک ہے“ پھر گیارہ منٹ بعد پتا چل جائے گا۔“
الیاس فاطمی بے اختیار پلٹا اور خود کو زمین پہ گھسیٹتے
دروازے کو نیم جاں ہاتھوں سے بجایا۔ باہر دونوں
پولیس اہلکار کھڑے اونچی آواز میں فون پہ بات کر رہے
تھے۔

”اگر تم نے دوبارہ دروازہ پیٹا تو میں اس شیشی کو توڑ
دوں گا۔ قریبی اسپتال جانے میں رش آور کے باعث
تمہیں پون گھنٹہ لگے گا۔“

گہرے گہرے سانس لیتے فاطمی نے ہاتھ کی پشت
سے ناگ رگڑی تو۔ اس پہ خون لگا تھا۔ اس نے خوف
اور وحشت سے سامنے چبوترے پہ بیٹھے فارس کو
دیکھا۔

”تم۔ کیا چاہتے ہو تم؟ میں نے تمہارے بھائی کو
نہیں مارا۔“

”مجھے معلوم ہے“ تم نے صرف اسے بیچا تھا۔“ وہ
شیشی کو ہاتھ میں کھماتے نگاہیں اس پہ جمائے بولا تھا۔
”مجھے دو سوالوں کے جواب دو“ تو میں یہ
antidote (تریق) تمہیں دے دوں گا۔ اگر
تمہارے منہ سے نکلنے والے اگلے الفاظ میرے سوال
کے جواب کے علاوہ ہوئے تو میں اسے توڑ دوں گا۔“
”بولو۔ بتاؤ۔ کیا پوچھنا ہے۔“ وہ نیم جاں زمین پہ
دوہرا ہوا بمشکل بول پایا۔

”وارث نے تمہیں کچھ فائلز دی تھیں“ یقیناً وہ
ثبوت تم نے کسی تک پہنچا دیے تھے اور انہوں نے
وارث کو مار دیا۔“ نگاہ اٹھا کر چھت سے لٹکتے پنکھے کو
دیکھا۔ ”ان فائلز میں کیا تھا؟“

”وہ۔ منی لانڈرنگ کر رہے تھے۔ وہ ان کی
کریشن کا پتا لگاتے لگاتے غلط سمت آ نکلا تھا۔“ بے
ربط پھولی سانسوں کے درمیان وہ بول رہا تھا۔ ”وہ
دہشت گردوں کے لیے منی لانڈرنگ کر رہے تھے۔
کراچی میں میٹنگز کا ریکارڈ تھا“ کوئی گواہ بھی تھے۔ وہ
میرے پاس نہیں ہیں۔ وارث کے لیپ ٹاپ میں
تھیں۔“

”اکی سی!“ اس نے گہری سانس لی۔ ”تو وہ دہشت

گرد ہیں۔ گڈ!“ وہ ہلکا سا مسکرایا۔ ”دوسرا سوال“ ان
لوگوں کا ماسٹرمانڈ کون ہے؟ ہر تنظیم کا ایک برین ہوتا
ہے، جو احکامات دیتا ہے۔ ان کا برین کون ہے؟ میرے
بھائی کے قتل کا حکم کس نے دیا تھا؟“

فاطمی کے کانوں سے خون رسنے لگا تھا۔ آنکھوں
سے پانی ٹپک رہا تھا اس نے نفی میں سر ہلایا۔
”وہ مجھے جان سے مار دے گا۔“

فارس نے شیشی کو اونچا اٹھایا۔ ”گویا گرانے لگا ہو“
فاطمی دہل کر رہ گیا۔ ”ہاشم۔ ہاشم کا دروازہ۔ تمہارے
بھائی کے قتل کا حکم ہاشم نے دیا تھا۔“

کمرے میں ایک دم موت کا سناٹا چھا گیا۔
اپنے تئیں دھماکا کر کے فاطمی نے اسی خوف اور
وحشت سے فارس کا چہرہ دیکھا۔ وہ سپاٹ تھا۔ سخت
اور سرد۔

”ہاشم کا دروازہ؟“ وہ دہراتے ہوئے اٹھا اور قدم قدم
چلتا فاطمی کے قریب آ کھڑا ہوا۔ گردن جھکا کر اسے
دیکھا۔

”میں نے پوچھا تھا“ ان کا برین کون ہے؟ ہاشم
کا دروازہ اس کی ماں؟“

فاطمی کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔ ”تم جانتے
ہو؟“ فضا ایک دم ساکت ہو گئی تھی۔

وہ ہلکا سا مسکرایا۔ ”میں ساڑھے چار سال سے جانتا
ہوں۔ یہ بھی کہ میرے بھائی اور بیوی کو کس نے قتل
کروایا“ یہ بھی کہ میرا بھانجا بھی ان ہی کے پاس ہے۔“
فاطمی نے تعجب اور بے یقینی سے نفی میں سر ہلایا۔
”مگر ہاشم نے کہا تھا“ تم نہیں جانتے کہ اس سب کے
پیچھے کون ہے۔“

”میں واقعی نہیں جانتا کہ ان سب کے پیچھے کون
ہے۔ ہاشم اپنی ماں کے پیچھے ہے یا جو اہرات اپنے بیٹے
کے پیچھے ہے۔ یہ جاننا میرے لیے ضروری ہے“ تاکہ
مجھے معلوم ہو سکے کہ مجھے کس کی جان اپنے ہاتھوں
سے لینی ہے۔“

”مگر ہاشم نے کہا تھا۔ تم اداکار نہیں ہو۔“ وہ اب
بھی بے یقین خوف زدہ تھا۔

”جس غازی کو وہ جانتا تھا وہ اداکار نہیں تھا۔“ اس نے اذیت سے آنکھیں موندیں۔ (جیل نے میرے ساتھ کیا کیا میں نے جیل میں کیا کیا ہے) آنکھیں کھولیں۔ ان میں سرد آگ تھی۔ ”ہاشم نہیں جانتا۔ کوئی نہیں جانتا اور اب تم لوگ مجھے دوبارہ وہیں بھیجنا چاہتے ہو۔“

”مگر۔ ہاشم نے کہا، تم سمجھتے ہو تمہاری بیوی نے تمہیں اس میں پھنسا دیا ہے۔“

”پانچ منٹ کے لیے میں نے یہی سمجھا تھا۔“

”تمہیں۔۔۔ تمہیں معلوم ہے تمہارا بھانجا۔“ اسے شدید کھانسی آنے لگی تھی۔ وہ بول نہیں پا رہا تھا مگر حیرت اور بے یقینی اسے اپنی حالت بھی بھلائے دے رہی تھی۔

”مجھے اس کے اغوا کے اگلے دن معلوم ہو گیا تھا کہ یہ سب ہاشم نے کروایا ہے مگر میں۔۔۔“ بچے کے بل اس کے قریب زمین پہ بیٹھا۔ ”میں وہ ساڑھے چار سال پہلے والا آدمی نہیں ہوں جس نے جیل جاتے ہی ہاشم کاردار کا نام لیا تھا۔ جیل نے مجھے بدل دیا ہے الیاس فاطمی! مجھے اداکاری آگئی ہے۔ مجھے لوگوں کے سامنے کیسا نظر آتا ہے یہ میں خود طے کرتا ہوں اب۔“ وہ ذرا سا اس پہ جھکا۔

”تم لوگ۔۔۔ ہمیشہ ایک بات بھول جاتے ہو۔ کہ فارس غازی۔۔۔ بھی ایک کاردار کی ہی اولاد ہے۔“ پھر شیشی والی مٹھی بلند کی۔ الیاس فاطمی دہرے ہوتے بے اختیار ہاتھ اٹھانے لگا مگر اتنی سکت ہی نہیں رہی تھی۔

”تم میرا راز جان چکے ہو۔ تمہیں زندہ نہیں رہنا چاہیے۔“

”جہیں۔۔۔ پلینز دیکھو میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ دیکھو وقت ختم ہو رہا ہے۔ یہ مجھے دے دو خدا کے لیے۔“ وہ شاید رو بھی رہا تھا۔

”اگر تم نے۔۔۔“ شیشی اوپر اٹھائے اس کی آنکھوں میں دیکھتے چبا چبا کر وہ بولا۔ ”کسی کو ایک لفظ بھی بتاتا تو مار کھنا۔ میں تمہیں نہیں ماروں گا۔ مگر

تمہاری بیٹی۔۔۔ جو شادی کے آٹھویں سال بالآخر اپنی اولاد کی منتظر ہے۔ صرف ڈھائی ماہ بعد۔۔۔ میں اس کا بچہ غائب کر دوں گا اور تم اور تمہارا سارا خاندان زندہ درگور ہو جاؤ گے۔ بری خبر یہ ہے کہ تمہاری بیٹی سفر نہیں کر سکتی، تم اس کو کہیں بھیج بھی نہیں سکتے۔“

وہ جلدی جلدی نفی میں سر ہلانے لگا اس کا گویا سانس بند ہو رہا تھا۔ ”میں کسی کو نہیں بتاؤں گا“ پلینز یہ مجھے دے دو۔“

فارس اٹھا، سیدھا کھڑا ہوا۔ گردن جھکا کر اسے دیکھا۔ ”میرا بھائی تمہارے پاس آیا تھا فاطمہ لے کر۔ اس نے تم پہ اعتماد کیا تھا اور تم نے معلوم ہے اس کے ساتھ کیا کیا؟“ اس نے شیشی فضا میں بلند کی۔ ”تم نے اسے چھوڑ دیا۔“ اور اس نے شیشی چھوڑ دی۔ الیاس فاطمی کے منہ سے چیخ نکلی۔ شیشی اس کے قریب گر کر چکنا چور ہو گئی۔ محلول بہہ گیا۔ وہ پاگلوں کی طرح جھک کر انگلیوں سے محلول اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”یہ تم نے کیا کیا۔۔۔ تم نے مجھے مار دیا۔“

فارس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ساتھ میں کچھ کہا بھی۔ المکار نے جلدی سے دروازہ کھولا اور اندر آیا۔ اس کی ہتھکڑی کو اپنی زنجیر کے ساتھ نتھی کیا۔ پھر نیچے گرے، پاگلوں کی طرح اس محلول کو چائے، روتے، بلکتے فاطمی کو دیکھا۔ ”یہ مرنے نہیں جائے گا۔“

”اس جیسے لوگ آسانی سے نہیں مرتے۔ فکر نہ کرو، زہر نہیں دیا۔ ٹارچر ڈرگ تھی، آدھے گھنٹے میں ٹھیک ہو جائے گا۔“ بے نیازی سے کہہ کر وہ ان کے ساتھ باہر نکل گیا۔ ادھر الیاس فاطمی ابھی تک کراہتے روتے اس محلول کو چائے کی سعی کر رہا تھا جو صرف۔۔۔ سادہ پانی تھا۔

راہ داری میں چلتے ہوئے زمر مخالف سمت سے آئی اور اس کو روکا۔

”کچھ معلوم ہوا؟“ دھڑکتے دل سے پوچھا۔ فارس نے نفی میں سر ہلایا۔

”اسے کچھ بھی نہیں معلوم۔ ابھی تک اس شخص کا پتا نہیں چل سکا جو فاطمی کو اس جج سے جوڑ

”اور اس پہ جو رقم لکھی ہے، وہ میری ابتدائی فیس ہے! سائن کرو یا کوئی اور وکیل ڈھونڈ لو!“

”یہ صرف ابتدائی فیس ہے؟“

”ہاں فارس۔ تم نے کیا بے مول سمجھ رکھا تھا مجھے؟“ مسکراتے ہوئے بھی اس کی آواز میں شکوہ در آیا تھا۔ فارس نے بس ایک تیز نظر اس پہ ڈالی، ہتھکڑی لگے ہاتھوں سے قلم تھاما اور سائن کرو یا۔ پھر اسے ان ہی نظروں سے گھورا تا جانے کے لیے پلٹ گیا۔

وہ اس ٹھنڈی سی سہ پہر میں ان اہلکاروں کو اسے حوالات میں ڈال کر لے جاتے دیکھتی رہی۔



انمول پتھروں کی قیمت لگائی ہے سب نے دیوار جو نہ بنے بازار بن کر جیتے سمندر کنارے وہ اونچی ہوٹل کی عمارت رات کے اس پہر روشن تھی۔ نیچے تاریک تہ خانے میں میری انجیو فون لیے سعدی کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ جو اضطرابی انداز میں مسلسل ٹہل رہا تھا، تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ آنکھوں میں شدید بے چینی تھی۔

”کال کرو ہاشم کو!“

”تم ٹھیک نہیں کر رہے سعدی! تم پچھتاؤ گے۔“

وہ شدید متفکر تھی۔ ”تمہیں فارس کے مشورے پہ بھروسہ ہے؟“

”دیکھو وہ غصے کے تیز ہیں، جلد باز ہیں، ہاتھوں سے سوچتے ہیں، میں سب جانتا ہوں مگر میرا دل کہتا ہے وہ ٹھیک کہہ رہے ہیں اور میں دل کی سننا چاہتا ہوں۔“

میری نے سر جھٹکا اور فون ملا کر ہاشم سے بات کروانے کا کہہ کر ریسیور اسے دیا۔

”بولو سعدی!“ ہاشم کا لہجہ خشک تھا۔

”میں اپنے وکیل کا نام بتانے کو تیار ہوں۔ مگر۔“

”مگر تمہیں بدلے میں کچھ چاہیے بتاؤ۔“ وہ آفس میں بیٹھا فون کان اور کندھے کے درمیان رکھے کاغذات کھنگال رہا تھا۔

”میں صرف آپ کو بتاؤں گا“ آپ اور آپ کی والدہ

سکے۔“ وہ بے زار اور خفا لگ رہا تھا۔

زمر کے چہرے پہ مایوسی پھیلی۔ ”کیا واقعی؟“

وہ۔ ”جی“ کہہ کر اہلکاروں کی معیت میں آگے بڑھ گیا۔ اس کا نام پکارے جانے کا وقت قریب تھا۔

آج اس کا چودہ روزہ جسمانی رہمانڈ ختم ہو رہا تھا۔ عدالت نے ضمانت کی درخواست مسترد کرتے ہوئے اسے جوڈیشل رہمانڈ پہ جیل بھیجنے کا حکم صادر کر دیا۔ اپنی گرفتاری کے چودہ دن بعد بالآخر وہ اسی جیل میں دوبارہ جا رہا تھا جو چار سال تک اس کا ”گھر“ بنی رہی تھی۔ وہ اس کے ساتھ چلتی باہر تک آئی تھی جہاں ”حوالات“ (جیل لے جانے کے لیے وین خوف ناک سواری) تیار کھڑی تھی۔ لمحے بھر کے لیے اس نے فارس کو روکا تھا۔

”آج عدالت نے تمام کاغذات، تفتیش کی تفصیلات، چالان وغیرہ کی کاپی ہمارے حوالے کر دی ہے۔ اب ہمارے پاس ایک ہفتہ ہے اگلی سماعت تک۔ سو اب تم جس کو چاہو اپنا وکیل مقرر کرو!“ وہ کچھ کہنے لگا تھا مگر زمر نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکتے بات جاری رکھی۔ ”لیکن اگر تم مجھے ہار کرنا چاہتے ہو تو۔۔۔“

فارس۔۔۔ تمہیں مجھ سے۔۔۔ ریکویسٹ کرنی ہوگی۔“

اس کا برو بے اختیار اٹھا۔ برہمی سے کچھ کہنے لگا۔ پھر گردن گھما کر دیکھا۔ اس کے انتظار میں اہلکار کھڑے تھے۔ بہت ضبط سے زمر کی طرف گھوما۔ وہ مسکرا رہی تھی۔

”مسز زمر۔۔۔“ ایک نظر اس کے پٹی میں بندھے ہاتھ پہ ڈالی، دوسری ٹاک کی لونگ پہ۔ ”کیا آپ کمرہ عدالت میں میری نمائندگی کرنا پسند کریں گی؟“

”پہلے کہو، پلیز!“ (اور یہ الفاظ کہتے اسے کچھ اور نہیں صرف کچھوے یاد آئے تھے۔)

فارس نے صبر کا گھونٹ بھرا۔ ”پلیز!“

”شیور!“ وہ مسکرا کر شانے اچکائی پرس کھنگالنے لگی۔ ”مگر تم یہ سائن کرو۔“ ایک چیک اور پین نکال کر اس کے سامنے کیا۔ فارس کے اب کی بار دونوں ابرو اٹھیں۔ ”یہ تو میری چیک بک کا چیک ہے۔“

دونوں میرے پاس آئیں گے اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ
جج کج بتاؤں گا۔ میں آپ کے لیے کام بھی کرنے کو تیار
ہوں لیکن بدلے میں 'میں' میں پیسے لوں گا بہت پیسے۔ وہ
پیسے میرے خاندان کو دیے جائیں گے اور میرا کج
آپ اور مسز کاردار — میرے ساتھ بیٹھ کر مجھ سے
ڈسکس کر کے طے کریں گے۔

”اس تبدیلی کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟“

”میں تھک چکا ہوں ہاشم بھائی! میں تنگ آ گیا
ہوں۔“ وہ روانی میں کہہ گیا تھا پھر رک کر مسکرایا اور
بظاہر تصحیح کی۔ ”ہاشم!“ میری کو دیکھتے آنکھ دبائی۔ اگر وہ
ندرت ہوتی تو جو نا اٹھالیتی۔

”اور پلیز۔ اس ہینو تھراپسٹ سے کہیں یہاں
سے چلی جائے میں نے نہیں کروانا اس سے علاج
کیوں میرے پیچھے پڑی ہے؟“ وہ کاغذ فائل سے نکالتا
رکا۔ ایک دم چونک کر چہرہ اٹھایا۔ فون کندھے سے
نکل کر ہاتھ میں لیا۔ ”کون تھراپسٹ؟“

”وہی سرخ اسکارف والی“ آپ کے بزنس پائٹری
بٹی۔ جس کو کرٹل خاور میرے پاس لایا ہے۔“ لحظے
بھر کورک۔ ”کیا آپ کو نہیں پتا؟“

دوسری طرف فون منقطع ہو چکا تھا۔ ہاشم موبائل
رکھتے ہی آندھی طوفان کی طرح کمرے سے نکلا تھا۔
ٹائی کی ٹاٹ ڈھیلے کرتے سرخ چہرے کے ساتھ وہ تیز
تیز قدم بڑھا تاہل عبور کر کے سامنے آیا۔ ایک کمرے
کا دروازہ کھولا۔

خاور فون پہ بات کر رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر اٹھا۔ ہاشم
آگے بڑھا، فون کا کریڈل کھینچ کر زمین پہ دے مارا۔
خاور ایک دم ششدر رہ گیا۔ اس نے گریبان سے پکڑ
کر خاور کو جھٹکادیا۔

”کس کی اجازت سے تم آبی کو وہاں لے کر گئے؟
تمہاری ہمت کیسے ہوئی؟“ سرخ آنکھوں سے اسے
دیکھا وہ دھاڑا تھا۔

”سرمے میں نے ہینو تھراپسٹ کی بات کی تھی
آپ سے۔ میں نے ہارون صاحب سے۔“ وہ
بکھڑکاتے ہوئے وضاحت دینے لگا۔

”بلکواس بند کرو“ تم میرے لیے کام کرتے ہو ہارون
عبید کے لیے نہیں۔“ غصے سے اس کا کالر جھٹک کر
اسے برے دھکیلا۔ ”تم مجھ سے پوچھے بغیر اتنا بڑا قدم
کیسے اٹھا سکتے ہو؟ مجھے یقین نہیں آ رہا۔“

”سرمے میں تو۔۔۔“
”بلکواس بند کرو۔“ اس نے زور سے بوٹ کی ٹھوکر
ماری اور نازک سی ٹی ٹرائل الٹ کر پیچھے جا گری۔
”ابھی۔۔۔ ابھی اس کو واپس لاؤ گے تم وہاں سے۔۔۔ خاور!
اگر وہ دوبارہ اس سے ملی تو میں تمہیں شوٹ کروں گا۔
ساتم نے۔“

خاور کا اہانت اور شاک سے بھرا چہرہ چھوڑ کر وہ اسی
طرح باہر نکل گیا۔ اسے کہیں پہنچنا تھا جلدی ورنہ
شاید وہ واقعی خاور کو شوٹ کر دیتا۔ خاور ابھی تک دنگ
تھا۔ پس منظر میں ایک آواز ابھری تھی۔
”تم کبھی کاردار نہیں بن سکتے۔ وہ تمہیں کبھی اپنے
ساتھ نہیں بٹھاتے۔“



رہا جتلا میں عمر بھر آگے کی دوڑ میں
جو آج مڑ کر دیکھا تو تنہا کھڑا تھا میں
سرد شاہ ان دنوں ایک ورکشاپ کے سلسلے میں
ملک سے باہر تھا۔ فارس غازی جو ڈیشل ریمانڈ پہ جس
دن جیل بھیجا گیا اس روز سرد شاہ واپس آیا تھا۔ ایر
پورٹ سے گھر کے راستے میں اس نے ڈرائیور سے
پوچھا تھا۔

”عائزہ بی بی کہاں ہیں؟ دو دن سے فون نہیں اٹھا
رہیں۔ لینڈ لائن بھی نہیں مل رہا۔“

ڈرائیور لا تعلقی کا اظہار کر کے خاموش رہا تھا البتہ
بار بار بیک ویو مرر میں صاحب کو دیکھتا ضرور تھا۔ کار
گیٹ کے اندر داخل ہوئی اور وہ دروازہ کھولتا باہر نکلا تو
دیکھا لان میں عائزہ اور شنزرا کے والد کھڑے تھے۔ وہ
دراز قد، سیاہ سرمئی قلموں والے، بھرے بھرے جسم
کے نومند انسان تھے، سفید شلوار اور سوٹ میں ملبوس
اور چہرے کا رنگ سرخ گلابی سا، ساتھ موجود چار افراد

دکن

دسمبر 2015 کا شمارہ شائع ہو گیا

✽ معروف اسٹریولوجسٹ "علی محمد" سے شاہین رشید

کی ملاقات

✽ اداکارہ "نمرہ بچہ" کہتی ہیں "میری بھی سنیے"

✽ "آواز کی دنیا سے" اس ماہ مہمان ہیں "نادیہ ایمینو نیل"

✽ اس ماہ "شاشنہزاد" کے "مقابل ہے آئینہ"

✽ "رہنمائی" تنزیلہ ریاض کا سلسلے وار ناول

✽ "ردائے وفا" فرحین اظفر کا سلسلے وار ناول

✽ "دل ٹوٹ کے ہارا تھا" نایاب جیلانی کا مکمل ناول

✽ "بھول موسم کا سودا کر" مصباح علی کا مکمل ناول

✽ "تم ہنستی اچھی لگتی ہو" زرین آرزو کا مکمل ناول

✽ "شاید" فائزہ افتخار کا دلکش ناولٹ

✽ "یہ تغافل دل یار" مریم ماہ منیر کا ناولٹ

✽ راشدہ رفعت، راجہ افتخار، اور دیا شیرازی کے افسانے

اور مستقل سلسلے

اس شمارے کے ساتھ کرن کتاب

"موسم سرما"

کا استقبال کیجیے

کرن کے ہر شمارے کے ساتھ علیحدہ سے مفت پیش خدمت ہے

بھی اسے دیکھ کر کھڑے ہوئے تھے۔ سرمد شاہ کو انہونی کا احساس ہوا تھا۔

"السلام علیکم انکل۔۔۔" وہ بظاہر مسکرا کر کہتا ہوا گلاسز گریبان میں اٹکاتا ان کی طرف آ رہا تھا۔ آئی جی صاحب آگے بڑھے اور ایک دم سے اسے گریبان سے پکڑ لیا۔

"ساری دنیا کہتی تھی، جیسا باپ ہے، ویسا بیٹا نکلے گا، پھر بھی میں نے تمہارا اعتبار کیا۔" انہوں نے بھاری بھر کم ہاتھ اس کے منہ پہ جڑا تھا۔ غصے سے وہ بہت سے مغالطات بھی کہہ رہے تھے۔ سرمد شاہ پیچھے کو لڑکھڑایا۔ "تم نے میری دونوں بیٹیاں برباد کر دیں۔" "انکل۔۔۔ کیا ہو گیا ہے؟" اس کا چہرہ سرخ ہوا، وہ ان کا ہاتھ روکنے کی کوشش کرنے لگا، دو نوجوان آگے بڑھے اور آئی جی صاحب کو تھام کر بمشکل ہٹایا۔ ایک نے سرعت سے سرمد شاہ کے ہاتھ پیچھے باندھے اور اس سے پہلے کہ وہ مزاحمت کر پاتا، اس نے ہتھکڑی بند کر دی۔

"کیا کر رہے ہو، چھوڑو مجھے۔۔۔ انکل۔۔۔ میری بات سنیں۔" وہ بھی غصے سے چلایا تھا۔ "وہ جھوٹ بول رہی ہے، وہ بکواس کر رہی ہے، میں۔۔۔"

"وہ تمہاری دوسری شادی کے بارے میں جان گئی تھی، اس لیے تم نے اسے اغوا کر لیا۔ تم نے میری بیٹی کو برباد کر دیا۔" وہ غصے اور دکھ سے پھر اس کی طرف بڑھے تھے مگر دونوں جوانوں نے انہیں پھر سے تھام کر پیچھے کیے رکھا۔

"سر! آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، آپ اندر جائیں، یہ ہمارے حوالے ہے۔" ایک آفیسران کو تسلی دے رہا تھا۔

"عائزہ کہاں ہے؟ عائزہ کو بلاؤ۔ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔" وہ ان دو ایلیکاریوں کے زرخے میں پھنسا، سرخ چہرے کے ساتھ چلا چلا کر ملازموں سے کہہ رہا تھا مگر کوئی نہیں سن رہا تھا۔

"نام مت لو میری بیٹی کا۔" وہ انگلی اٹھا کر تنبیہ کرتے کرتے تھے۔ "عائزہ، عرصہ، اور شنزاکو ملک

سے باہر بھیج دیا ہے میں نے ساری زندگی تم اپنے بیٹے کی شکل کو ترسو گے۔ تم بھی تو جانو اولاد کو کھونے کا درد کیا ہوتا ہے سرد۔“

”آپ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔ چھوڑو مجھے، میرا بیٹا کہاں ہے؟“ وہ چلا پاتا تھا۔

”اسے دور لے جاؤ میری نظروں سے۔ اس سے طلاق نامے پہ دستخط کرواؤ اور پراپرٹی کے کاغذوں پہ بھی۔ اس کو۔ اس کو اتنا مارو ولید کہ اس کی شکل بدل جائے۔“ وہ تیز تیز بولتے ہانپنے لگے تھے۔ دو اہلکار اس کو زبردستی کھینچتے، کھینچتے گاڑی کی طرف لے جا رہے تھے۔

”دیکھ لوں گا میں تم سب کو۔ کوئی بھی عدالت میں مجھ پہ کچھ ثابت نہیں کر سکتا۔“ وہ ہڈیانی انداز میں چلایا تھا۔ آفیسر نے اسے کار میں دھکا دیا، پھر جھک کر سختی سے اس کا چہرہ دیکھا۔

”کون سی عدالت؟ ہم تمہیں تمہارے جیسے کسی تھانے نہیں لے جا رہے۔ ہم تمہیں بیورو کی زیر زمین جیل میں لے جا رہے ہیں۔ کمرنل پروسیجو کو رٹ ہم پہ اپلائی نہیں ہوتا، نہ ہم تمہیں کسی عدالت میں پیش کریں گے۔ آج سے تم ایک مسنگ پرسن ہو۔“ اور کھٹاک سے دروازہ اس کے منہ پہ بند کیا۔ آئی جی صاحب ابھی تک غصے سے ہانپتے اس کو گالیاں دے رہے تھے۔ پھر وہ تھک کر کرسی پہ تڑھال سے بیٹھ گئے۔ انہیں معلوم تھا وہ طاقت ور لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے لگا ہے، وہ ناجائز پیسہ بناتا ہے، فیور زد ہوتا ہے مگر انہوں نے اسے کچھ نہیں کہا۔ وہ غیر جانب دار رہنا چاہتے تھے اور انسان کو جہنم میں اس کی غیر جانب داری ضرور پہنچاتی ہے۔

انیکسی کے تہ خانے میں دیوار پہ لگے کاغذوں کے سامنے حنین کھڑی تھی۔ ہاتھ اونچا کر کے اس نے سرد شاہ کی تصویر اتاری اور اس کے دو ٹکڑے کر کے قریب جلتے بیٹرہ رکھ دیے۔ آگ کے شعلے تصویر کو اپنی لپیٹ میں لے کر سیاہ کرنے لگے۔

کبھی جو مدتوں بعد اس کا سامنا ہوگا سوائے پاس آداب تکلف کے اور کیا ہوگا حنہ نے اطمینان سے مڑ کر زمر کو دیکھا جو میز پر فائلیں اور کتابیں رکھے نوٹس بنا رہی تھی۔ سر اٹھائے بغیر بولی۔

”اس کو انجوائے مت کرو۔“

حنہ چونکی پھر سر جھٹک کر بولی۔ میں انجوائے تو نہیں کر رہی۔

زمر کے موبائل کی ٹون بجی تو وہ فون اٹھا کر دیکھنے لگی۔ اس کے ڈاکٹر کا پیغام تھا۔

”خوش قسمتی سے ایک ڈونر کا بندوبست ہو گیا ہے۔ اس کا نمبر بھیج رہا ہوں“ آپ اس سے بات کر لیں اور تمام معاملات طے کر لیں۔ غریب آدمی ہے، پیسوں کی سخت ضرورت ہے اسے۔“ ساتھ ہی ایک نمبر موصول ہوا۔ زمر نے گہری سانس لی اور ”ڈونر“ کے نام سے اسے محفوظ کر دیا۔ دل سے ایک بوجھ سا ہٹا تھا۔

”وہ فالٹز کہاں تک پہنچیں حنین؟“

”بتایا تھا تا، اپنی ایک فلیش خاور کے پاس لے کر گئی تھی، اس پہ تجربہ کر کے اس سے انکریٹ کرنے کا طریقہ سیکھا ہے۔ اب ان فالٹز پہ احتیاط سے اپلائی کر رہی ہوں وہ طریقہ بہت سی چیزیں اب بھی نہیں معلوم، سو کچھ دن لگیں گے۔ شاید مہینہ۔ مگر ہو جائے گا۔“ وہ پُر امید تھی۔

ان سے چند کوس دور، قصر کاردار کالاؤنچ پورا روشن تھا اور اوپر سے نوشیرواں چہرے پہ ڈھیروں بے زاری سجائے، شستی سے زینے اتر رہا تھا۔ جمائی روکتے وہ نیچے آیا اور صوفیہ ڈھیر ہو گیا۔ آنکھوں کے گلابی پن سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ڈرگزا استعمال کر رہا تھا۔

”ممی کہاں ہیں فہنو تا؟“ فہنو تا سامنے آئی تو اس نے پکارتے ہوئے میز پہ پیر رکھے اور موبائل چہرے کے سامنے کیے فیس بک کھولنے لگا۔

”مسز کاردار اور ہاشم صاحب صبح سری لنکا کے لیے نکلے تھے۔ ان کی کوئی میننگ تھی اور ایک سیمینار بھی

تھا۔

”ہوں۔“ وہ خاموشی سے بیٹھا موبائل دیکھتا رہا۔
شہرین کی ساری ٹائم لائن چیک کی۔ ایک ایک پوسٹ
پڑھی مگر پھر بے زار ہو گیا۔ سر جھٹک کر چہرہ اٹھایا تو
مرکزی دیوار پہ بڑا سا کٹورین ڈیزائن کا فریم آویزاں
دیکھا جس میں وہ چاروں کھڑے مسکرا رہے تھے۔
اورنگ زیب ہاشم جواہرات اور وہ خود۔ شیرواسے
تکے گیا، مکمل فیمیلی گروپ فوٹو۔

ایک خیال نے ذہن پہ ہلکی سی دستک دی۔ کیا یہ
مکمل گروپ فوٹو تھا؟ مگر فیمیلی تو مکمل نہ تھی۔ کسی
معمول کی طرح اس نے موبائل اسکرین کو چھوا۔
سرچ کے خانے میں لکھا۔ ”علیشا کاردار“ اور کچھ
بھی سوچے بنا کلک کر دیا۔

فہرست میں پہلے نام کی بریکٹس میں لکھا تھا۔
(Ants Ever After) جس زمانے میں گھر
میں اس لڑکی کے نام پہ جواہرات اور اورنگ زیب میں
لڑائی ہوتی تھی تب اس نے سرچ کیا تھا اس کو۔ شاید
اسی لیے اس کا نام اب بھی نکل آیا تھا۔ سرفہرست۔
نو شیرواں نے یروفا نل کھولی۔ کور فوٹو پہ کلک کیا۔ وہ دو
ہفتے قبل لگائی گئی تھی۔ پہلے سے ذرا بڑی بڑی اور
مسکراتی ہوئی علیشا کتابیں لیے کسی یونیورسٹی کے
باہر کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں۔ شیروانے اسکرین کو
زوم ان کیا۔ بالکل اورنگ زیب جیسی تھیں۔
نو شیرواں جیسی۔ فارس جیسی۔

کتنے ہی پل بیت گئے۔ وہ یوں ہی گردن ترچھی کیے
اس کی تصویر دیکھتا رہا۔ وہ اسپتال سے صحت یاب ہو کر
آئی تھی اور اب تعلیم حاصل کر رہی تھی یہ تصویر
سے واضح تھا۔ بغیر کسی دوسرے خیال کو ذہن میں
لائے شیروانے فرینڈ ریکوسٹ کے آپشن کو کلک
کر دیا۔

”دوستی کی درخواست بھیج دی گئی ہے۔“ فیس بک
نے ادب سے اطلاع دی۔ وہ عجیب سا محسوس کرنے
لگا تھا۔



نہ شاہ پہ مرے ہم، نہ شاہ سے ڈرے ہم!
کچھ عجیب گر نہ ہوتے شاہکار بن کے جیتے
کو لبو پر خم، بھیگی ہواؤں میں اس شام عجیب سا جوش
تھا۔ جو مایوسی کی انتہا پہ پہنچنے والوں کو نئے دن کے
سورج کی امید دلایا کرتا ہے۔ ایسے میں اس طویل
قامت ہوٹل کی عمارت کی ایک کھڑکی سے اندر جھانکو
تو بیڈ پہ نیم دراز آبدار کتاب پڑھتی دکھائی دے رہی
تھی۔ بال اسکارف سے آزاد، گہبے اور سرخ رنگ کے
تھے۔ چمکتا ہوا سرخ بھورا رنگ۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل پہ
دھرا موبائل خاموش تھا۔ اس پہ ہاشم کی پچھلے سات
دنوں میں سات کالز آئی تھیں جو اس نے نہیں اٹھائی
تھیں۔ خاور کی ایک ہی تھی جو اس نے سن کر بے رخی
سے صرف اتنا کہا تھا۔

”ابھی وہ دن نہیں آیا جب ہاشم کاردار مجھ پہ حکم چلا
سکے، جب مرضی ہوگی پھلی جاؤں گی۔“ اور گھٹاک
سے فون بند کر دیا تھا۔

اب بھی پڑھتے پڑھتے اس نے اچانک دراز کھولی
اور وہ مڑا تڑا سا کاغذ نکالا۔ ہمن۔ اس کا کیا مطلب
تھا؟ وہ الجھ کر اس تصویر پہ ہاتھ پھیرنے لگی۔
زیر زمین جاؤ تو سعدی کے کمرے کے باہر بنے
لاؤنج میں ہاشم گرے سوٹ، ٹائی اور مسحور کن پرفیوم
میں لپٹا، ایک کرسی پہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھا تھا۔
جبکہ جواہرات دزدیدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی
رس نیچے رکھتی، دوسری کرسی پہ بیٹھ رہی تھی۔ اس
کے لبوں پہ مسکراہٹ مگر آنکھوں میں شدید کوفت
تھی۔

سعدی سامنے آکھڑا ہوا تو وہ ہر وقت مسکرائی۔
زناکت سے ماتھے پہ آئے بال انگلی سے پیچھے جھٹکے اور
سر سے پیر تک اسے دیکھا۔

”تم کیسے ہو سعدی؟ مجھے خوشی ہے کہ تم نے
درست راستے کا انتخاب دیر سے ہی سہی مگر کر لیا۔“
وہ سفید ٹی شرٹ اور نیلی جینز میں ملبوس تھا۔
چہرے پہ سنجیدگی اور آنکھوں میں نرمی تھی۔ ذرا سا
مسکرایا۔

”میں ٹھیک ہوں مسز کاردار۔ کیا آپ نے مجھے کبھی مس کیا؟“ پھر مقابل کر سی پہ بیٹھا اور ایک نظر ہاشم پہ ڈالی جو سنجیدہ اور سپاٹ نظر آ رہا تھا۔

”کیوں نہیں۔ تم ہمارے بہت اچھے دوست تھے سعدی!“

”میں اب بھی آپ ہی کا دوست ہوں۔“ اس نے جواہرات کی آنکھوں میں دیکھ کر یاد دہانی کروائی۔

”کام کی بات پہ آؤ سعدی! تمہیں کیا چاہیے؟ می کو بمشکل میں نے ساتھ آنے پہ راضی کیا ہے۔ اگر اس میں پھر تمہاری کوئی گیم ہوئی تو۔“

”شہرین کاردار۔ میری وکیل شہرین تھی۔“ وہ تیزی سے بولا۔ ”اس کو دی گئی میں نے ویڈیو کی ایک کاپی۔ نیلے رنگ کے لفافے میں ایک سی ڈی ہے جو encrypted ہے۔ اس نے اپنے کمرے کے لاکر میں رکھی تھی۔“

ہاشم بری طرح چونکا تھا۔ ٹانگ سے ٹانگ ہٹائی۔ ایک نظر جواہرات کو دیکھا جو دوسری جانب یک ٹک دیکھ رہی تھی۔ ”میری ادھر کیا کر رہی ہے؟“ میری پچن کی جو کھٹ پہ سر جھکائے کھڑی تھی۔

”شہری؟ شہری نے۔ تم سچ بول رہے ہو؟“

”میں جھوٹ نہیں بولتا، تمہیں پتا ہے۔“ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اسی انداز میں بولا تھا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

”میری ادھر کیسے ہاشم؟“ جواہرات کسی خواب کی سی کیفیت میں بولی تھی۔ بے یقین نگاہیں میری پہ جمی تھیں۔

”میری کو ہاشم نے میری دیکھ بھال کے لیے رکھ لیا ہے مسز کاردار۔ فکر نہ کریں۔ ہمارا بہت اچھا وقت گزر رہا ہے یہاں۔“ مسکرا کر اطلاع دی تو جواہرات ایک دم گم صدم سی اسے دیکھنے لگی۔

”کام کی بات پہ آؤ سعدی، تمہارا بیس کچ؟“

”میں نے آپ کو یہاں کچھ اور تانے کے لیے بلایا ہے۔“ ہاشم کے چہرے پہ برہمی ابھری۔

”تمہارے گیمز نہیں ختم ہوں گے، میں جا رہا

ہوں۔“ وہ بے زار سا کھڑا ہوا ہی تھا کہ سعدی نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا۔

”تمہارے باپ کی موت طبعی نہیں تھی۔ اسے قتل کیا گیا تھا۔“

لمحے بھر کو ہر شے ساکت ہو گئی۔ باہر بہتا سمندر تیز چلتی نم ہوا، ہاشم کی آنکھیں اور جواہرات کی دھڑکن۔

”کیا بکواس ہے یہ؟“ وہ بیٹھا نہیں انداز میں غصے سے زیادہ تعجب تھا۔

”تمہارے باپ کا چہرہ مرتے وقت بے حد سفید تھا۔ تم نے ڈاکٹر سے بھی پوچھا تھا مگر ڈاکٹر نے تم سے جھوٹ بولا۔ اس نے کہا یہ ایسٹھما کی وجہ سے ہے۔“ وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ لمحے بھر کے لیے بھی ہاشم کی آنکھوں سے نگاہیں ہٹائے بغیر۔ ”مگر ڈاکٹر بک چکا تھا۔ تم نے بھی یقین کر لیا، کیونکہ تمہارے نزدیک یہ ناممکن تھا کہ تمہارے ناقابل تسخیر باپ کو تمہارے دیوتا جیسے باپ کو کوئی قتل کر سکے۔ قتل تو ہم چیونٹیوں جیسے لوگ کیے جاتے ہیں۔ پیر کے نیچے مسلے جاتے ہیں۔ آج میں تمہیں بتاؤں گا کہ تمہارا باپ بھی قتل ہوا تھا۔“

جواہرات ایک دم کھڑی ہوئی۔ وحشت سے دور کھڑی میری کو دیکھا اور پھر سعدی کو جو ہاشم کے مقابل کھڑا تھا۔ اس نے ہاشم کا چہرہ دیکھا، وہ برہم تھا، متعجب تھا اور۔ اور وہ چونکا ہوا بھی لگتا تھا۔

”تم جھوٹ بول رہے ہو۔“

”تمہارے آفس آکر بھی تم سے سب سچ بولا تھا میں نے ہاشم۔ تم مجھے جانتے ہو۔ میں ثبوت اور گواہ دیکھ چکا ہوں، اسی لیے کہہ رہا ہوں، تمہارے باپ کو قتل کیا گیا تھا اور جانتے ہو کس نے قتل کیا انہیں؟“ وہ ہلکا سا مسکرایا، ایک سرد تپتی نگاہ سفید چہرے والی جواہرات پہ ڈالی۔

وہ نمک کا مجسمہ بنی کھڑی تھی۔ بے یقین خوف زدہ۔ یہ کچھ کرنے کا وقت تھا۔ وہ بے ہوش ہو جائے، طبیعت خرابی کا کہہ کر ہاشم سے کہے کہ وہاں سے نکلیں۔ اسے سعدی کو خاموش کروانا تھا مگر وہ جانتی

شے مگر تھے سانسوں کے ساتھ سعدی کو دیکھ رہا تھا۔
سعدی ایک قدم مزید آگے بڑھا، ہاشم کی آنکھوں میں
آنکھیں ڈالے مسکرایا۔ ”خاور۔۔۔ کرنل خاور نے قتل
کیا ہے تمہارے باپ کو۔“

اور چند فلور اوپر۔۔۔ بیڈ پہ نیم دراز سرخ بالوں والی
لڑکی کاغذ کو دیکھتی ایک دم سیدھی ہو کر بیٹھی۔ اس کی
بلی جیسی آنکھیں چمکی تھیں۔

”میں اسے غلط دیکھ رہی تھی، یہ کانٹا نہیں ہے۔“
وہ دبے دبے جوش سے بڑبڑاتی تھی۔ ”یہ کراس ہے“

صلیب ہے اور یہ لفظ۔۔۔ یہ ہمن نہیں ہے۔۔۔ یہ
ہامان ہے۔“ اس کے ابرو اٹھیں۔ ”اور ہامان کون تھا؟“

وہ چونکی۔ ”فرعون، موسیٰ کا وزیر۔۔۔ اس کا دست
راست۔۔۔ اس کے سارے کام سرانجام دینے والا۔۔۔

اس کی حفاظت کرنے والا۔“ وہ متعجب ہوئی۔ اتنے
دن بعد اس نے بالآخر وہ پیغام ڈی کرپٹ کر لیا تھا جو کہہ

رہا تھا۔
”ہامان کوسے سولی چڑھا دو!“

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

For Next Episodes Visit
paksociety.com

احمد علی سیّد



فَاخْرُو جِبِیْنَ

قیمت - 400 روپے

منگوانے کا پتہ:

فون نمبر:
32735021 مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی

تھی ہر بات بے سود تھی۔
”ہاشم! یہ جھوٹ بول رہا ہے“ اس کی بات مت
سنو۔“ بدقت وہ بڑبڑاتی۔ دل ڈوب رہا تھا مگر ہاشم نے
نہیں سنا۔ اس کا غصہ کم ہو رہا تھا اور وہ چونک کر سعدی
کو دیکھ رہا تھا۔

”تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“
”جاؤ، اپنے ڈاکٹر کی کنیٹی پہ پستول رکھو اور اس سے
پوچھو کہ کس نے رپورٹ بدلنے کا حکم دیا تھا؟ وہ بھی
اسی کا نام لے گا جس کا نام میں لوں گا، بتاؤں کون ہے
وہ؟“

”ہاشم۔۔۔“ جواہرات کی آنکھوں میں آنسو آ
ٹھہرے۔ وہ صرف ہاشم کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ وہ سعدی
کی آنکھوں میں دیکھتے کسی ٹرانس میں تھا۔ وہ پریقین
نہیں تھا، مگر وہ شک میں تھا۔

”تم میرے ساتھ کوئی کھیل کھیل رہے ہو، مجھے
معلوم ہے سعدی!“

”مگر تمہاری آنکھیں کہہ رہی ہیں کہ تم اس شخص
کا نام جاننا چاہتے ہو تو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ کس نے
قتل کیا تمہارے باپ کو۔“ پھر سے ایک کاٹ دار نظر
جواہرات پہ ڈالی۔ ”تمہارے باپ کو اس نے مارا ہے“
جس کے ساتھ تم ایک چھت تلے رہتے ہو۔ قاتل
تمہارے گھر میں سے ہی ہے۔“

جواہرات کو لگا سعدی نے زنجیر کا پھندا اس کی
گردن میں ڈال رکھا ہے اور اب آہستہ آہستہ زنجیر
گھما رہا ہے۔ گویا کھینچنے ہی والا ہو۔

”کس کی بات کر رہے ہو؟“
”وہ جس کو تم سے محبت کا دعوا ہے۔ تمہاری خیر
خواہی کا دعوا ہے، تم سے دوستی کا دعوا۔ جس پہ تم
بہت اعتماد کرتے ہو۔ اس نے تمہیں دھوکا دیا ہے
ہاشم کاردار!“

جواہرات کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔
اس کا سانس رک چکا تھا۔ گردن کے گرد زنجیر تنگ
ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

”کون؟ کس کی بات کر رہے ہو؟“ وہ بھی شک و